وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد أُوتِيَ خَيرًا كَثِيرًا ★ (البقرة: ٢٦٩)

ماهنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۵ | ذوالحجۃ ۱۴۱۶ھ مئی ۱۹۹۶ء | شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

گزشتہ ماہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر انتظام دو اہم پروگرام ہوئے۔ اولاً جمعہ ۵ / اپریل کو مرکزی انجمن کا چوبیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا اور پھر ۱۹ تا ۲۱ / اپریل "محاضراتِ قرآنی" کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ دونوں پروگرام مرکزی انجمن کی روایات کا مستقل حصہ سمجھے جاتے ہیں جن کا اراکین انجمن اور رفقاء و احباب کو ہر سال شدت کے ساتھ انتظار رہتا ہے۔

مرکزی انجمن کا چوبیسواں سالانہ اجلاس دراصل انجمن کی تاریخ کا چوبیسواں سنگِ میل تھا۔ اس موقع پر گزشتہ سال کے دوران انجمن کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے علاوہ انجمن کی قریباً ربع صدی کی کارگزاری پر تنقیدی نگاہ ڈالنے اور خدمتِ قرآنی کا جو کام اللہ کی توفیق سے اس ادارے کے ذریعے اب تک ہو سکا ہے اس پر تہہ دل سے اللہ کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ آئندہ دو سالوں کے لئے مرکزی انجمن کی مجلس شوریٰ کے نصف ارکان کے انتخاب کا مرحلہ بھی بحسن و خوبی طے پایا۔ اجلاس کے پروگرام میں حسب معمول صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا خطاب بھی شامل تھا۔ صدر مؤسس نے اپنے خطاب میں مرکزی انجمن کی گزشتہ ربع صدی کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کی تائید و توفیق سے خدمتِ قرآنی کی عظیم سعادت ہمارے حصہ میں آئی۔ اس اہم اجلاس کی مکمل روداد جس میں صدر مؤسس کے خطاب کا خلاصہ بھی شامل ہے' اس شمارے میں قارئین کی نظر سے گزرے گی۔

اس سال محاضرات قرآنی کا پروگرام قدرے مختلف انداز کا تھا۔ قبل ازیں مرکزی انجمن کی تاریخ میں صرف دو بار محاضرات قرآنی انگریزی زبان میں ہوئے۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ محاضرات کی تینوں نشستوں کے مرکزی مقرر ایک ہی تھے اور ان کے تینوں خطابات انگریزی زبان میں ہوئے۔ امریکہ میں پرورش پانے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ایک پاکستانی نوجوان باسط بلال کوشل جو گزشتہ کئی برسوں سے رجوع الی القرآن کی اس تحریک سے وابستہ ہیں جس کے داعی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہیں اور جو اب امریکہ میں بھی بھرپور طور پر متعارف ہو چکی ہے' ان محاضرات کے مرکزی مقرر تھے --- باسط بلال گزشتہ سال قرآن کالج میں ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں شرکت کی غرض سے امریکہ سے پاکستان تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ایک باقاعدہ طالب علم کے طور پر اس کورس میں شرکت کی۔ قرآن کالج سے بنیادی عربی گرامر اور فکر قرآنی کی تحصیل کے بعد وہ جرمن زبان سیکھنے اور عربی زبان میں مزید مہارت حاصل کرنے کی غرض سے اسلام آباد منتقل ہو گئے تھے اور اب امریکہ

(باقی صفحہ ۶ پر)

ڈاکٹر اسرار احمد

۱۲ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم　　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّھَا وَ مُسْتَوْدَعَھَا ؕ کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ (ھود: ٦)

قرآن حکیم کا بارہواں پارہ "وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔ اس کے نصف سے زائد پر سورۂ ہود پھیلی ہوئی ہے اور بقیہ حصے میں سورۂ یوسف کا تقریباً نصف حصہ آگیا ہے۔ سورۂ ہود کے مضامین سورۃ الاعراف کے مضامین سے بہت مشابہ ہیں۔ اس کے اکثر حصے میں اولوالعزم من الرسل یعنی چھ اولوالعزم رسولوں کا ذکر ہے جن کی قوموں نے ان کی دعوت سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا یعنی قوم نوح جن کی طرف حضرت نوح علیہ السلام بھیجے گئے، قوم عاد جن کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے، قوم ثمود جن کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے، قوم لوط جن کی طرف حضرت لوط علیہ السلام کو بھیجا گیا، اصحاب مدین جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام بھیجے گئے، اور آلِ فرعون جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام بھیجے گئے۔ ان قوموں کے حالات کا ذکر قرآن مجید میں جو بار بار آیا ہے تو وہ درحقیقت اہلِ عرب کو بالعموم اور قریشِ مکہ کو بالخصوص تنبیہہ کے لیے آیا ہے کہ اگر تم نے بھی ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی روش اختیار کی تو تمہارا حشر اور انجام بھی وہی ہوگا جو سابقہ امتوں اور قوموں کا ہو چکا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے حالات قرآن مجید میں سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اسی سورۂ مبارکہ میں وارد ہوئے ہیں اور ان کے احوال کے ضمن میں وہ دردناک نقشہ بھی پیش کر دیا گیا ہے کہ جب عذابِ الٰہی نازل ہو گیا اور طوفان آگیا اور حضرت نوح علیہ السلام اور اہلِ ایمان کشتی میں سوار ہو گئے تو حضرت نوحؑ نے اپنے ایک بیٹے کو دیکھا کہ وہ بھی اسی سیلاب میں ہاتھ پاؤں

مار رہا ہے تو حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا: یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا وَلَا تَکُنْ مَّعَ الْکٰفِرِیْنَ ۝ (ہود: ۴۲) "میرے بیٹے آؤ اور اس کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافروں کا ساتھ نہ دو۔" لیکن اس کی نگاہ اسباب و وسائل پر تھی، لہٰذا اس بدبخت نے جواب دیا: سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ "میں عنقریب پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا، جو مجھے پانی کے اس سیلاب سے بچا لے گا۔" حضرت نوحؑ نے انتہائی دردناک پیرائے میں فرمایا: لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ "آج کے دن اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کھائے۔" وَحَالَ بَیْنَھُمَا الْمَوْجُ فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ۝ (ہود: ۴۳) "اسی اثنا میں ایک بڑی موج باپ اور بیٹے کے مابین حائل ہو گئی اور بیٹا غرق ہو گیا۔"

معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں رشتہ داریوں کا معاملہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک جلیل القدر پیغمبرؑ کا بیٹا بھی اگر کفار کے ساتھ تھا تو انہی کے انجام کے ساتھ دوچار ہوا، اور پیغمبر کی نگاہوں کے سامنے وہ بھی غرق ہونے والوں کے ساتھ ہو گیا۔ یہی بات ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنے انتہائی قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو جمع کر کے ہر ایک سے فرداً فرداً فرمائی۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا: یَا فَاطِمَۃُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَکِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ لَا اَمْلِکُ لَکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ۝ (مسلم، ترمذی) "اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی (رضی اللہ عنہا) خود اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کر، اس لیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے بارے میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا۔"

سورۂ ہود کے بعد قرآن مجید میں سورۂ یوسف آتی ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ پورے قرآن مجید میں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس پوری سورۃ میں ایک ہی نبی کے حالات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے احوال۔ حضرت یوسف علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو حجاز میں بیت اللہ کے قریب آباد کیا۔ اور چھوٹے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو فلسطین میں آباد کیا۔ ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ ہیں جن کا لقب اسرائیل ہے اور انہی سے بنی اسرائیل ایک عظیم قوم اور ایک بڑی امت دنیا میں چلی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، دس بڑی بیوی سے اور دو چھوٹی بیوی سے۔ یہ دو حضرت یوسفؑ اور ان کے حقیقی بھائی بنیامین تھے۔ حضرت یعقوبؑ کو ان دونوں سے بہت

پیار تھا۔ بڑے بیٹوں میں اس سے حسد اور رقابت کا مادہ پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت یوسفؑ کا کانٹا اپنے راستے سے نکالنے کے لیے باہمی مشاورت سے حضرت یوسفؑ کو ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے ان کی اس عداوت و دشمنی کو حضرت یوسف علیہ السلام کے دنیاوی عروج کا زینہ بنا دیا۔ چنانچہ اس راستے سے گزرنے والے قافلے کے پانی بھرنے والے شخص نے جب اپنا ڈول اس کنویں میں پھینکا تو حضرت یوسفؑ اس کی رسی پکڑ کر باہر آ گئے۔ قافلے والوں نے انہیں غلام بنا لیا اور بڑی جلدی سے' مبادا کوئی ان کا طلب گار یا دعوے دار آ جائے' فوراً مصر پہنچ گئے اور انہیں اونے پونے داموں فروخت کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت دیکھئے کہ حضرت یوسفؑ کے خریداروں میں اس وقت کا ایک بہت بڑا عہدیدار عزیز مصر تھا۔ اس نے حضرت یوسفؑ کو خریدا اور اپنی بیوی کو خصوصی ہدایت کی کہ اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرے۔ عَسٰٓی اَنْ یَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (یوسف: ۲۱) ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو اور کیا عجب کہ ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے مختارِ مطلق ہے: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ اکثر لوگوں کو اس کا فہم نہیں ہے کہ لوگ کسی کا بُرا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کا برا چاہنے ہی سے اس کے حق میں کسی خیر کا فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو خصوصی تلقین فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے میرے برادر! اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ اگر سب لوگ مل کر تمہیں نقصان پہنچانا چاہیں تو نہ پہنچا سکیں گے مگر بس اتنا کہ جتنا اللہ نے لکھ دیا ہو اور تمام انسان مل کر تمہیں فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکیں گے مگر صرف اتنا کہ جتنا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہو۔ عجیب بات یہ ہے کہ عزیز مصر نے اپنی بیوی کو تلقین کچھ اور کی تھی لیکن اس کی نیت کسی اور طرف بھٹک گئی۔ اس نے حضرت یوسفؑ کو گناہ کی دعوت دی' حضرت یوسفؑ پر اللہ کا فضل ہوا کہ انہوں نے اس گناہ کی دعوت کو ٹھکرا دیا، لیکن وہ بدبخت اس سے تلملا کر رہ گئی اور اس نے حضرت یوسفؑ سے عداوت اور دشمنی کا سلسلہ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں بالآخر حضرت یوسفؑ کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ لیکن انبیاء و رُسل اور اللہ کی طرف بلانے والوں کی یہ عجیب سُنّت ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے مشن کے لیے راستہ نکال لیتے ہیں' چنانچہ حضرت یوسفؑ نے جیل میں بھی دعوتِ توحید کا آغاز کر دیا۔ اپنے جیل کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

(یوسف: ۳۹) "اے میرے جیل کے ساتھیو! کیا بہت سے معبود بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر چھایا ہوا ہے، سب پر حاوی ہے"۔ اس کے بعد توحید کا وہ نعرۂ مستانہ ان کی زبان پر آتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ (یوسف: ۴۰) "حکم کا اختیار سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں، حاکمیت صرف اسی کے لیے ہے"۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا کہ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

تو ارشاد فرماتے ہیں اپنے جیل کے ساتھیوں سے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس نے صرف یہ حکم دیا ہے کہ اس کی سوا کسی کی بندگی نہ کرو، اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی ہے دینِ قیم، یہی ہے سیدھا دین، یہی ہے دینِ حق، جو ہمیشہ ہمیش کے لیے قائم رہنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی دینِ حق پر کاربند ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بقیہ : حرف اول

مراجعت کے لئے پابہ رکاب ہیں۔

بحمد اللہ یہ محاضرات ہر اعتبار سے نہایت بھرپور اور کامیاب رہے۔ باسط بلال کے خطابات کو بہت دلچسپی سے سنا گیا اور اس پروگرام کی افادیت کو اہل علم کے حلقوں میں بھی بجا طور پر محسوس کیا گیا۔ معروف صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی نے روزنامہ "جنگ" میں اپنے کالم "جلسہ عام" میں ان محاضرات کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا اور باسط بلال کی اس کاوش کو قابل تحسین قرار دیا۔ شامی صاحب کا یہ کالم ندائے خلافت کی حالیہ اشاعت میں شائع کر دیا گیا ہے --- باسط بلال کا تعارف نامکمل رہے گا اگر سرگودھا میں مقیم ان کی قابل احترام خالہ محترمہ شائستہ جبیں کا ذکر نہ کیا جائے جن کے ذریعے باسط بلال صاحب رجوع الی القرآن کی اس تحریک اور اس کے داعی سے متعارف ہوئے۔ موصوفہ سرگودھا میں ایک گرلز کالج میں لائبریرین ہیں اور گزشتہ کم و بیش دس برسوں سے مرکزی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ نہایت سرگرم کارکن ہیں۔ صدر مؤسس کے دروس و خطابات کے کیسٹ زیادہ سے زیادہ عام کرنا ان کی زندگی کا مشن ہے۔ انہی کے ارسال کردہ کیسٹ کے ذریعے باسط بلال صاحب کے کانوں تک رجوع الی القرآن کی یہ دعوت پہنچی تھی۔ فجزاھا اللّٰہ احسن الجزاء!

قومی ملکیتِ زمین اور اسلام

تحریر : چوہدری صادق علی مرحوم

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سیاسی سطح پر ہمارے قومی خلفشار اور ملک کے سسٹم میں موجود لاتعداد برائیوں اور خرابیوں کی جڑ موجودہ جاگیرداری نظام ہے جو پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے پچاس برس بعد بھی آج جوں کا توں قائم ہے۔ اس نظام کے تار و پود بکھرنے اور نئے منصفانہ بندوبست اراضی کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ مسئلہ ہے کہ آیا پاکستان کی اراضی کو قومی ملکیت قرار دینے اور جاگیرداروں سے ان کی جاگیریں سلب کر کے غریب کسانوں میں تقسیم کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی شرعی جواز موجود ہے بھی یا نہیں؟ زیر نظر مقالے میں صاحب مقالہ نے مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ پاکستان کی اراضی جاگیرداروں اور زمینداروں کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ عامتہ المسلمین کے لئے وقف ہیں۔ اس ضمن میں حضرت عمر فاروقؓ کا تاریخی اجتہاد ہی دراصل سارے مسئلہ کا حل ہے۔ احباب جانتے ہیں کہ اس ضمن میں مرکزی انجمن کے صدر موسس کا موقف بھی یہی ہے جس کا اظہار وہ گاہے بگاہے اپنے خطابات و تقاریر میں کرتے رہتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے موقف کی وضاحت اور پرزور تائید زیر نظر مقالے کے ذریعے عمدگی سے ہوتی ہے۔

صاحب مقالہ جناب چوہدری صادق علی مرحوم نے ۱۹۶۸ء میں ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر فیصل آباد کے عہدہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد یہ مقالہ تحریر کیا۔ موصوف ایک نمایاں علمی حیثیت کے مالک تھے۔ اردو زبان کے علاوہ عربی' فارسی اور انگریزی پر بھی یکساں عبور حاصل تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور علامہ عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ سے ایک طویل عرصہ نہایت قریبی تعلق رہا۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے درس قرآن میں شرکت کرنے اور ان سے تفسیر قرآن کا علم سیکھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

چوہدری صادق علی مرحوم کے صاحبزادے میاں محمد اسلم صاحب جو نہ صرف یہ کہ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے باقاعدہ رکن ہیں بلکہ ایک طویل عرصے انجمن خدام القرآن فیصل آباد کے صدر بھی رہے' کے ذریعے یہ بات ہمارے علم میں آئی کہ ان کے والد مرحوم ایک بار محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا خطاب جمعہ سننے کے لئے باہتمام لاہور تشریف لے گئے۔ بعد ازاں محترم ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن کے متعدد کیسٹ سننے کا بھی انہیں موقع ملا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے درس سننے کے بعد مرحوم کا تاثر یہ تھا کہ "اہل لاہور کو مولانا احمد علی لاہوری مرحوم و مغفور کے بعد ایک اچھا مدرس قرآن ڈاکٹر اسرار احمد کی صورت میں ملا ہے"۔ زیر نظر مقالے کے علاوہ مولف نے بعض دیگر مضامین بھی تحریر فرمائے جو ہفت روزہ "خدام الدین" میں شائع ہوئے۔ (ادارہ)

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم اَمَّا بَعْد۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اس کرۂ ارض پر دو بڑی سلطنتیں قائم تھیں۔ سلطنتِ ایران اور سلطنتِ روم۔ ان دونوں ملکوں میں جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام اپنی تمام قباحتوں کے ساتھ نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ امراء اور وزراء ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ بقول شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ 'ایرانی امراء کے سروں پر جو پٹکے تھے وہ بھی ایک ایک لاکھ روپے کی قیمت کے ہوتے تھے۔ دوسری طرف عوام بیچارے ٹیکسوں کے بوجھ میں ایسے دبے ہوئے تھے کہ دو وقت کا کھانا بھی انہیں مشکل سے مہیا ہوتا تھا۔ یہ حال ان ملکوں کے عوام کا تھا جو اپنے زمانہ میں متمدن ترین شمار ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عروج دیا اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں یہ دونوں ملک مسلمانوں نے فتح کر لئے اور بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی اسلام کا عادلانہ اقتصادی نظام نافذ ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں صرف چند سالوں میں عرب' عراق' ایران' روم' مصر اور شام وغیرہ تمام ممالک کے عوام میں وہ خوشحالی آ گئی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اس عادلانہ نظام کی برکت سے مخلوق خدا اس قدر خوشحال ہو گئی کہ زکوٰۃ کے مستحق افراد کا تلاش کرنا مشکل ہو گیا اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ آئندہ حکومت امیر لوگوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کرے گی کیونکہ حکومت کے لئے مستحقین زکوٰۃ کو تلاش کر کے ان میں زکوٰۃ تقسیم کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے' آئندہ یہ کام زکوٰۃ ادا کرنے والے خود کریں!۔ سبحان اللہ' کیا ہی اچھا زمانہ تھا۔ ہر فردِ مملکت کو ضروریات زندگی یعنی روٹی کپڑا مکان وغیرہ بآسانی دستیاب تھا۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

زمانہ خلافت کے بعد جب پھر ملوکیت کا دور دورہ آ گیا اور اسلام کی روشنی مخلوق کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہو گئی' اسلام کی بجائے زمانہ جہالت کے نظریات پھر عالمِ انسانیت پر چھا گئے تو آہستہ آہستہ وہی زمانہ جاہلیت کے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام

قریباً تمام دنیا پر رواج پا گئے۔ اسلامی ممالک میں بھی اگرچہ حکمران مسلمان تھے مگر اسلام کا عادلانہ اقتصادی نظام عملاً کہیں بھی نافذ نہ رہا۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی مسلمان حکمرانوں کے وقت جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نافذ تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی ایک تحریر میں سلطنتِ مغلیہ کے شہزادگان اور امراء کی تشبیہ ان امراء اور وزراءِ ایران کے ساتھ دی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہے تھے اور بیشتر عوام الناس کو روٹی کپڑا اور مکان بھی میسر نہ تھا۔

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد انگریزوں کا دور آیا۔ انگریزی راج میں نظامِ سرمایہ داری اور جاگیرداری کو مزید فروغ حاصل ہوا۔

آزادیٔ ملک کے بعد اگر ہمارے حکمران پاکستان کی سرزمین میں اسلامی آئین اور اسلامی اقتصادی نظام نافذ کرنے کی سعی کرتے تو ہم بتدریج خلافتِ راشدہ کے دور کی برکات سے ہمکنار ہو سکتے تھے۔ مگر یہ بات قابل افسوس ہے کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بعد ان کے جانشینوں نے حالات کو بدلنے کی کماحقہٗ کوشش نہ کی اور نظام حکومت کی اصلاح نہ ہو سکی۔ دورِ ایوبی میں تو سرمایہ داری نظام اپنے بدترین نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ صنعت و حرفت' درآمد و برآمد اور تجارت میں بدترین قسم کی اجارہ داریاں قائم ہو گئیں' جنہیں شریعت کی اصطلاح میں اکتناز اور احتکار کہا جاتا ہے۔ ان اجارہ داریوں کی بدولت ملک کی بیشتر دولت سمٹ کر بائیس خاندانوں میں آ گئی۔ ملک بیرونی قرضوں کے بوجھ میں دب گیا۔ اور ان قرضوں کا مفاد بھی بیشتر طور پر بائیس خاندانوں نے حاصل کیا اور عوام بتدریج غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔ عوام میں ان سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کا پھیل جانا ایک فطری امر ہے۔ اب ہمارے عوام اس موجودہ نظام سے تنگ آ چکے ہیں اور اقتصادی انقلاب چاہتے ہیں۔

انقلاب کی خواہشمند جماعتیں

پاکستان کی تمام سیاسی اور دینی جماعتیں اصلاحات چاہتی ہیں' اگرچہ اصلاحات کے پروگراموں اور منشوروں میں قدرے تفاوت ہے۔ ان میں سے بعض حضرات اسلامی

سوشلزم یا مساواتِ محمدی کے نام پر انقلاب کے خواہاں ہیں اور بعض خالص اسلام کے نام پر ملک کا نظام بدلنا چاہتے ہیں۔ تبدیلی کے سبھی خواہشمند ہیں اور اپنے اپنے پروگرام کے مطابق انقلابِ احوال کی تگ و دو بھی کر رہی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہمارا ملک اساسی طور پر زرعی ملک ہے۔ ہماری آبادی کا قریباً اَسّی فیصد حصہ زراعت سے وابستہ ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کاشت کار اور مزارع کی خوشحالی کے لئے فوراً قدم اٹھایا جائے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ جو حضرات زرعی اور صنعتی اصلاحات کو عین قرآن اور سُنّت کے مطابق نافذ کرنے کے دعویدار ہیں انہوں نے بھی خالص شرعی اقتصادی نظام کی تفصیلات عوام کے سامنے پیش نہیں کی ہیں۔ بیچارے کاشت کار اور مزدور زیادہ تر ناخواندہ ہیں۔ ان بیچاروں کو اب تک یہ بات ذہن نشین نہیں کرائی جا سکی کہ آئین شریعت اور مساواتِ محمدی نافذ کرنے سے ان کی اقتصادی حالت میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں گی۔ کیا اسلام انہیں کمیونزم اور سوشلزم سے کچھ زیادہ مراعات دے گا یا کم۔ لہٰذا وہ بیچارے رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کی کشمکش سے پریشان ہیں۔ ان کے قلوب کی یہ کیفیت ہے کہ :لا یَعرِفُون حقًّا وَلا یُنکِرُون باطلاً (نہ تو انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ حق کس طرف ہے اور نہ وہ باطل کا انکار کر سکتے ہیں) اپنی محدود سمجھ کے مطابق بیچارے کسانوں اور مزدوروں کو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ اسلامی سوشلزم یا محمدی مساوات کے نفاذ سے انہیں کچھ زیادہ ہی ملے گا۔ خالص اسلام کے دعویداروں نے اپنے سیاسی منشورات میں تحدیدِ ملکیتِ اراضی کو شامل کیا ہوا ہے حالانکہ شریعتِ مطہرہ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے ع

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

زمین کی حدِ ملکیت

تحدیدِ ملکیتِ اراضی شریعت کے بھی خلاف ہے' نیز اس سے کاشتکاروں کی مالی حالت میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ پاکستان میں بڑے زمینداروں کی تعداد بہت کم ہے' لہٰذا تحدیدِ ملکیتِ اراضی سے بہت تھوڑے مزارعان کو مالی فائدہ ہو گا اور کاشت

کاروں کی بیشتر تعداد مایوسی کا شکار ہو جائے گی۔ اس وقت ضرورت تو اس بات کی ہے کہ نظامِ زراعت میں ہمہ گیر انقلاب لایا جائے اور یہ کام شریعت کے حدود کے اندر رہ کر کیا جائے۔ اس ضمن میں علماء کرام سے گزارش ہے کہ وہ صورتِ مسئولہ پر ٹھنڈے دل سے غور کریں' نیز اس اہم معاملہ میں علمی تحقیق کر کے رہنمائی فرمائیں' تاکہ عوام زمین کے معاملہ میں شریعتِ مطہرہ کے احکام اور مساواتِ محمدی کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں اور اہلِ حل و عقد ان شرعی اصلاحات کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے آئین کا جزو بنا سکیں۔

تقسیمِ اراضی

ہند اور پاکستان کا یہ برصغیر مسلمانوں کی آمد سے قبل کفار کا ملک تھا۔ مسلمانوں نے مختلف اوقات میں اس کے مختلف علاقوں کو فتح کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مفتوحہ علاقہ کی اراضیات کو حکومتِ اسلامیہ شرعی لحاظ سے کیسے استعمال کر سکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب فقہِ عمر میں اس مسئلہ پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب عراق کا ملک مسلمانوں نے فتح کیا تو بعض صحابہ کرامؓ نے یہ مطالبہ کیا کہ اس ملک کی تمام زرعی اراضی مجاہدین میں مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر دی جائے' جس طرح کہ مفتوحہ اموال کو تقسیم کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمیق نظر نے محسوس کیا چونکہ سلطنتِ اسلامیہ اب بہت وسیع ہو چکی ہے اور جزیرۃ العرب سے باہر کے ممالک بھی اس میں شامل کئے جا رہے ہیں لہٰذا اب مستقل فوج ممالکِ مفتوحہ میں رکھی جانی اشد ضروری ہے تاکہ مفتوحہ علاقوں میں لوگ بغاوت نہ کر سکیں۔ قبل ازیں کوئی مستقل فوج نہیں تھی۔ جب بھی ضرورت پیش آتی تمام مسلمان جہاد کے لئے روانہ ہو جاتے تھے اور اموال غنیمت میں سے ۵/۴ حصہ ان کو تقسیم کر دیا جاتا تھا اور خُمس بیت المال میں غرباء مساکین اور یتامیٰ کی پرورش کے لئے داخل کر لیا جاتا تھا۔ اب چونکہ مستقل فوج اور چھاؤنیوں کے قیام کی ضرورت ہے لہٰذا مفتوحہ علاقہ کی اراضی کو بجائے مجاہدین میں تقسیم کرنے کے قومی ملکیت قرار دے دیا جائے اور اس کے لگان کی آمدنی سے فوج کی تنخواہیں ادا کی جائیں اور سامانِ حرب یعنی اسلحہ وغیرہ خریدا جائے۔ نیز اس آمدنی سے مملکت کے

غربا اور مساکین بھی فائدہ اٹھائیں گے۔ اس تجویز کی بعض صحابہ کرامؓ نے شروع میں مخالفت کی اور حضرت عمرؓ سے پُرزور مطالبہ کیا کہ عراق کی اراضی کو بھی مجاہدین میں تقسیم کیا جائے۔ جیسا کہ خیبر کی اراضی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرمائی تھی۔ ان مطالبہ کرنے والوں میں حضرت بلالؓ بن حارث بھی شامل تھے۔ آخر ایک بڑی مجلس منعقد کی گئی جس میں جلیل القدر مہاجرین اور انصار نے شرکت کی۔ اس میں تمام اہل علم حضرات شامل ہوئے اور ایک دوسرے کے دلائل پر غور و فکر کیا۔

اراضی کی قومی ملکیت کے حق میں حضرت عمرؓ کے دلائل

(۱) نصِ قطعی یعنی قرآنی دلائل :

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کی سورۂ حشر کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف توجہ دلائی جن میں مال غنیمت کے متعلق احکام بیان کیے گئے ہیں :

مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(اور جو کچھ پھیرلایا اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کی طرف (یعنی مالِ فَے) ان بستیوں والوں سے پس وہ ہے واسطے اللہ کے' واسطے رسول کے' واسطے قرابت والوں کے' یتیموں کے' فقیروں کے اور مسافروں کے' تاکہ مال و دولت تم میں سے صرف مال داروں ہی کے پاس نہ جمع ہو جائے۔ اور جو کچھ دیوے تم کو رسولؐ پس لے لو اور جس سے منع کرے پس باز رہو اس سے اور ڈرو اللہ سے' تحقیق اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔)

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ

اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

(یہ مال فقیر مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں سے اور مالوں سے نکالے گئے ہیں' اللہ تعالٰی کا فضل اور رضامندی چاہتے ہیں' مدد کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول ؐ کی۔ یہی لوگ سچے ہیں۔)

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِىْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(اور یہ مال) ان لوگوں کے واسطے ہے جو رہتے ہیں دارِ ہجرت اور ایمان میں (یعنی مدینے میں) پہلے سے محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کی طرف آئے ہیں اور اپنے دلوں میں اس چیز کے متعلق خلش نہیں پاتے جو مہاجرین کو دی جائے۔ اور اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کو خود تنگی ہو۔ اور جو کوئی اپنی جان کی بخیلی سے بچایا جائے' پس وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔)

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِىْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (سورۂ حشر' رکوع ۱)

(اور یہ مال) ان کے لئے بھی ہے جو ان کے بعد آئے' کہتے ہیں اے رب بخش دے ہم کو اور اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کی برائی نہ رکھ جو ایمان لائے ہیں۔ اے ہمارے رب تحقیق تو شفقت کرنے والا مہربان ہے۔)

ان آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ مالِ غنیمت میں پہلے نمبر پر مہاجرین کا حق ہے جنہوں نے اللہ تعالٰی کی رضا کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دیا' نیز اللہ اور رسول ؐ کے دین کی نصرت کے لئے جہاد کیا۔ دوسرے نمبر پر مال غنیمت میں ان کا حق ہے جو پہلے سے ہی مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور مہاجرین کے ساتھ سچے دل سے محبت کرتے ہیں' اگر مہاجرین کو کوئی چیز عطا کی

جائے تو اس سے وہ اپنے دلوں میں خلش محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں' یعنی ایثار کرتے ہیں حالانکہ وہ خود تنگی میں ہیں۔ تیسرے نمبر پر مال غنیمت میں ان کا بھی حق ہے جو بعد میں آنے والے ہیں اور ان کے حق میں دعائیں کرتے ہیں جو ایمان والے ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ یعنی مال غنیمت میں نہ صرف مجاہدین کا حصہ ہے بلکہ آئندہ نسلوں کے مفاد کے لئے بھی اسے صرف کیا جا سکتا ہے جس کی یہی صورت ہے کہ زرعی اراضی کو حکومت کی ملکیت قرار دیا جائے اور اس اراضی کی آمدنی افواج پر اور دوسرے مستحقین پر خرچ کی جائے۔

(۲) سُنّتِ رسول اللہ سے دلیل :

حضرت عمرؓ نے یہ دلیل بھی دی کہ زمانہ نبوت میں خیبر کی اراضی تو مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھی مگر فتح مکہ کے بعد کفارِ مکہ کی غیر منقولہ جائیداد کو تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا دونوں صورتوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا ہے۔ یعنی حکومت چاہے تو ایسی اراضیات کو مجاہدین میں تقسیم کر دے اور چاہے تو مفتوحہ علاقہ کی زمین کو قومی ملکیت قرار دے دے یا سابقہ مالکوں کے پاس ہی رہنے دے۔

اجماعِ صحابہؓ سے زمین قومیانے کا ثبوت

ان تمام دلائل و شواہد پر غور و فکر کرنے کے بعد تمام صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ متفق ہو گئے اور عراق کی اراضی مسلمانوں کی قومی ملکیت قرار دے دی گئی۔ اس اراضی کے انتظام کے متعلق اجماع صحابہؓ کے ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا کہ عراق کے ذِمی کفار جو اس وقت اراضی کاشت کر رہے تھے وہی بدستور کاشت کرتے رہیں مگر حکومت کو مناسب لگان (کراء الارض) ادا کریں۔ ان تمام واقعات کی امام اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی معرکہ آرا کتاب الخراج میں تصریح فرمائی ہے کہ حضرت عمرؓ کی تقریر سن کر سب صحابہ کرامؓ نے فرمایا :

فقالوا جمیعًا الرأی رأیک فنعم ما قلت وما رأیت

(کتاب الخراج ص ۲۴ تا ۲۹)

(سب نے کہا رائے وہی صحیح ہے جو آپ فرماتے ہیں۔ آپ نے جو فرمایا اور مناسب سمجھا ہے وہی بہتر اور خوب ہے)

یعنی حضرت بلالؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ جو شروع میں حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف رکھتے تھے وہ سب اس پر متفق ہو گئے اور اس پر تمام صحابہ کا اجماع ہو گیا کہ علاقہ مفتوحہ (محروسہ) کی اراضی قومی ملکیت میں لی جا سکتی ہے۔ امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ یہ واقعات تحریر کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں :

"یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق کا نتیجہ تھا اور دراصل اسی میں تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی اور خراج کا جمع ہونا اور اس کا مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہونا جماعتی مفاد کے اعتبار سے تقسیم اراضی کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر اور مفید تھا"۔

(کتاب الخراج، امام ابو یوسف، صفحہ ۲۴ تا ۲۹)

چونکہ خلافتِ راشدہ یعنی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس بات پر تمام امت کا اجماع ہوا تھا کہ مفتوحہ علاقہ کی اراضی قومی ملکیت میں لی جا سکتی ہے لہٰذا ہمارے اپنے ملک کے بعض مقتدر اور جیّد علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ اس برصغیر کی اراضی بھی مفتوحہ علاقہ ہونے کی بنا پر قومی ملکیت میں لی جا سکتی ہے۔

حضرت شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کا فتویٰ

حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے مرید اور متبحر عالم و شیخ کامل تھے، انہوں نے "تحقیق اراضیٔ ہند" کے نام سے ایک مستقل رسالہ شاہنشاہانِ مغلیہ کے دور میں تصنیف کیا تھا۔ اس رسالہ میں شیخ صاحب موصوف نے تصریح فرمائی ہے کہ اراضیٔ ہند شخصی ملک نہیں بلکہ "ارضِ مملکت" اور وقف لِلمسلمین ہو کر بیت المال کی ملکیت ہیں۔ اس رسالہ کی عبارت یہ ہے :

والحجة لعلمائنا فی التقریر تقریر امیر المومنین

عمرؓ لسواد عراق بموافقة من الصحابة رضوان اللّٰه علیهم اجمعین فی الهدایة فی باب الغنائم واذا فتح الامام بلدة عنوة ای قهرًا فهو بالخیار ان شاء قسمه مابین المسلمین کما فعل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بخیبر وان شاء اقرا هله علیه ووضع علیهم الجزیة وعلی اراضیهم الخراج کذلک فعل عمرؓ لسواد العراق بموافقة من الصحابه رضوان الله علیهم اجمعین ولم یحمد من منانعه فی کل من ذلک قدوة فیتخیّر (تحقیق اراضیٔ ہند' ص ۳' بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام' مصنفہ: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی' ص ۴۰۰)

(ترجمہ:) "اور تقریر (یعنی خلیفہ کا ملک کی زمین کو مسلمانوں کی انفرادی ملکیت بنانے کی بجائے مفتوح غیر مسلموں کے قبضہ میں باقی رکھنا اور اس کی ملکیت کو حکومت کی قرار دینا) کے متعلق ہمارے علماء احناف کی دلیل حضرت عمرؓ کی وہ تقریر ہے جو صحابہ کرام کی موافقت سے سواد عراق کے متعلق ان سے عمل میں آئی۔ ہدایہ باب غنائم میں ہے کہ اگر امام کسی شہر کو قہر اور غلبہ کے ساتھ فتح کرلے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اس کی اراضی کو مسلمانوں میں تقسیم کردے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کے متعلق کیا' اور چاہے تو مفتوح آبادی کے قبضہ میں اس کو رہنے دے اور اس پر جزیہ مقرر کرکے ان کی اراضیات پر خراج مقرر کردے جیسا کہ عراق کی اراضی کے متعلق حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کی موافقت کے ساتھ کیا' جس کسی نے مخالفت کی تو اس کو ناپسند سمجھا گیا۔ بہرحال امام ان دونوں باتوں میں مختار ہے اور دونوں اس کی صوابدید کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں"۔

کیا پاکستان کی زمین زمینداروں کی مِلک ہے؟

ان تصریحات کے بعد حضرت تھانیسریؒ اس بحث کا خلاصہ یہ نکالتے ہیں:

"پس نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہندوستان کی اکثر اور بیشتر اراضی ان لوگوں

کی ملکیت نہیں جو اس پر قابض ہیں"۔ (تحقیق اراضی ہند' ص ۱۲ و ۱۳)

بعد میں حضرت محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنے رسالہ میں اراضی ہند کے متعلق یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ فرد یا جماعت کی شخصی ملکیت نہیں ہیں بلکہ ارض مملکت اور ارض بیت المال ہیں۔ (بحوالہ العرف الشذی' تقریر رأس المحدثین مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری' صفحہ ۲۸۶)

حکومت برطانیہ کے زمانہ میں بھی محققِ عصر حضرت شاہ عبدالعزیز نور اللہ مرقدہ نے بھی اپنے مشہور فتاویٰ موسومہ بہ "فتاویٰ عزیزی" میں یہی فیصلہ دیا کہ اراضیٔ ہند بیت المال کی ملکیت ہیں' شخصی مملوکہ نہیں ہیں اور یہاں زمیندار مالک کی حیثیت میں نہیں بلکہ منتظم کی حیثیت میں ہیں' اس لئے اراضیٔ ہند نہ عُشری ہیں نہ خراجی۔ حضرت شاہ صاحب موصوف فتاویٰ عزیزی میں تحریر فرماتے ہیں :

"حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز رسالہ در احکام اراضی ہند قلمی فرمودہ۔ اندراں رسالہ ایں مذہب را بشواہد و دلائل بسیار ابطال فرمودہ۔ تحقیق فرمودہ اندکہ اراضیٔ ہند بدستور اراضیٔ سوادِ عراق موقوف برملک عامۂ مسلمین بے تخصص است یعنی در ملک بیت المال است و زمینداراں را بیش از قیم بودن دخلے نیست و قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نیز دریں باب رسالہ نوشتہ ہمیں مسلک در ترجیح دادہ"۔

(ترجمہ) "حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ اراضیٔ ہند کے احکام کے متعلق لکھا ہے اور اس رسالہ میں انہوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں کی ملک ہیں) بہت سے دلائل اور شواہد سے باطل قرار دیا اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضیات آج بھی بدستور سابق عراق کی اراضی کی طرح عامۂ مسلمین کے لئے وقف ہیں۔ یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں' کسی شخص یا فرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت ہیں اور نہ زمینداروں کو نگران ہونے سے زیادہ دخل ہے' اور قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ نے بھی اس بارہ میں ایک رسالہ تصنیف کیا اور انہوں نے اس میں شیخ جلال الدین تھانیسری ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے"۔

(جاری ہے)

روداد اجلاس

چوبیسواں سالانہ اجلاس عام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

منعقدہ ۵ / اپریل ۱۹۹۶ء

مرتب : نعیم الدین احمد' منتظم عمومی

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ۲۴واں سالانہ اجلاس عام مورخہ ۵ / اپریل ۱۹۹۶ء بروز جمعتہ المبارک بعد نماز مغرب' قرآن آڈیٹوریم' اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوا۔ اجلاس عام کی صدارت محترم صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فرمائی۔ یہ سالانہ اجلاس اراکین انجمن کی حاضری کے اعتبار سے نہایت بھرپور اور کامیاب رہا۔ اس میں بزم ہائے خدام القرآن کے ناظم جناب ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب اور معزز رکن مجلس شوریٰ جناب قمر سعید قریشی صاحب کی مساعی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حافظ عاکف سعید صاحب کی تلاوت قرآن مجید سے سالانہ اجلاس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد معتمد انجمن' ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے حاضرین اجلاس کو خوش آمدید کہا اور نہایت مختصر الفاظ میں مرکزی انجمن کی چوبیس سالہ تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ یہاں انہوں نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا کہ پچھلے سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک مؤسس رکن انجمن چوہدری نصیر احمد وِرک صاحب مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی تھی اور اسی اجلاس میں جناب اقتدار احمد صاحب جو کہ شدید علالت کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے تھے' کے لئے صحت کی دعا کی گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ جناب اقتدار احمد صاحب ۶ / جون ۹۵ء کو اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے ہیں اور انہوں نے مرحوم کے لئے اجتماعی دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ ساتھ ہی انہوں نے بتایا کہ آج کے اجلاس میں حسب دستور مجلس شوریٰ کے نصف ارکان (یعنی ۲۵ میں سے ۱۳) کا انتخاب

بھی عمل میں لایا جائے گا۔ بعد ازاں انہوں نے گزشتہ سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۱/ اپریل ۹۵ء) کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اراکین انجمن کی طرف سے صحتِ تحریر کی تصدیق کے بعد جناب صدر مؤسس نے روداد کی توثیق عطا فرمادی۔

جناب ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے حسب پروگرام ناظم اعلیٰ جناب سراج الحق سید صاحب کو سال ۹۵ء کی سرگرمیوں کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ موصوف نے ذاتی طور پر حاضرین کو خوش آمدید کہا اور اجلاس میں تشریف لانے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ خصوصیت سے انہوں نے منسلک انجمنوں کے صدور' فیصل آباد انجمن سے ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب' انجمن راولپنڈی اسلام آباد سے جناب محمد صدیق صاحب' انجمن سندھ کراچی سے جناب عبداللطیف عقیلی صاحب اور انجمن سرحد پشاور سے ڈاکٹر محمد اقبال صافی صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے اجلاس کے لئے وقت نکالا اور تشریف لائے۔

انہوں نے بتایا کہ سال ۹۴ء میں مرکزی انجمن کی مجلس شوریٰ کے قیام کا فیصلہ عمل میں لایا گیا تھا جبکہ ترمیم شدہ دستورِ انجمن اپنی حتمی صورت میں ۹۵ء کے سالانہ اجلاس کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ دستور کی رُو سے ہر مجلس شوریٰ چار سال کے لئے منتخب ہوگی' البتہ ہر دو سال کے بعد نصف اراکین مجلس شوریٰ کا انتخاب ہوا کرے گا۔ لہٰذا پہلی مرتبہ نصف اراکین مجلس شوریٰ کو قرعہ اندازی کے ذریعہ ریٹائر کیا گیا ہے اور آج ان کی جگہ نئے اراکین مجلس شوریٰ کا انتخاب اجلاس کا ایک اہم جزو ہے۔ بعد ازاں جناب ناظم اعلیٰ نے سال ۹۵ء کی سرگرمیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ پانچ سال سے انجمن کی سالانہ رپورٹ وہ خود مرتب کر رہے ہیں' لیکن اس سال (۹۵ء) کی سالانہ رپورٹ مدیر عمومی جناب محمود عالم میاں صاحب نے مرتب کی ہے جس سے رپورٹ پڑھنے والوں کو ایک تازہ ہوا کے جھونکے کا احساس ہوگا۔

جناب ناظم اعلیٰ نے اراکین انجمن کے اعداد و شمار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ سال ۹۵ء کے دوران انجمن کے حلقہ محسنین' مستقل ارکان اور عام ارکان کی تعداد میں بالترتیب ۵' ۴ اور ۴۰ کا اضافہ ہوا اور اس طرح ان تینوں حلقوں کی کل تعداد بالترتیب

۳۱۸' ۱۶۷ اور ۴۲۴ ہو گئی۔ انہوں نے توجہ دلائی کہ سال ۹۵ء میں اراکین انجمن کی تعداد میں بہت کم اضافہ ہوا ہے' بلکہ یہ اضافہ سال ۹۴ء کے اضافہ سے بھی کم ہے۔ انہوں نے کہا کہ انجمن کے اخراجات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جبکہ آمدنی میں اس طور سے اضافہ نہیں ہو رہا۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر آمدنی میں اضافہ نہ ہوا تو اللہ نہ کرے کہ ہمیں وہ دن دیکھنا پڑے جب پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی طرح انجمن کو بھی رول بیک کرنا پڑے۔

انجمن کے شعبہ اکیڈمک ونگ کا ذکر کرتے ہوئے ناظم اعلیٰ نے فرمایا کہ اس شعبہ نے دوران سال ۹۵ء چھ نئی کتب شائع کیں' چار کتابوں کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع کئے اور ۲۱ کتابوں کے اغلاط کی تصحیح کے بعد نئے ایڈیشن شائع کئے۔ ماہنامہ میثاق' حکمت قرآن اور پندرہ روزہ ندائے خلافت معمول کے مطابق شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک عرصہ سے انجمن میں شعبہ انگریزی کی کمی کا احساس شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا' الحمدللہ ۹۵ء میں اس شعبہ کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ اب محترم صدر موسس کے دروس و خطابات کے انگریزی میں ترجمہ کے علاوہ ایک انگریزی پرچہ "The Quranic Horizons" جلد شروع کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے خسارہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ سال ۹۵ء کے دوران ان تینوں پرچوں کا خسارہ = /۱,۶۸,۹۰۰ روپے ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے خریداروں اور اشتہارات کی کمی بیان فرمائی۔ بعد ازاں انہوں نے حاضرین سے اپیل کی کہ وہ انجمن کے ان پاکیزہ پرچوں کے لئے عریانی اور فحاشی سے پاک صاف ستھرے اشتہارات کا انتظام کریں اور نہ صرف خود ان کے قاری بنیں بلکہ ان کے خریداروں میں اضافہ کی کوشش کریں اور اس طرح ان کے خسارہ میں کمی کرنے میں مدد فرمائیں۔

جناب ناظم اعلیٰ نے بتایا کہ مرکزی انجمن کی لائبریری میں سال ۹۵ء کے دوران ۱۹۶ کتب کا اضافہ ہوا۔ اس طرح کتب کی کل تعداد ۵۸۸۷ ہو گئی ہے۔ ۱۳۰ ہفت وار اور ماہوار رسائل تبادلہ کے طور پر موصول ہوتے ہیں۔ روزانہ پانچ اخبار' جن میں تین اردو اور دو انگریزی ہیں' خریدے جاتے ہیں۔

جناب ناظم اعلیٰ نے حاضرین کو بتایا کہ سال ۹۵ء میں ماہ رمضان کے دوران دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت انجمن ملتان پنجاب کے جناب مختار حسین فاروقی صاحب کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس اہم ذمہ داری کو نبھایا۔ انجمن کے شعبۂ حفظ سے ۲۰ طلبہ نے حفظِ قرآن کی تکمیل کی۔ سب سے کم عرصہ میں قرآن مجید حفظ کرنے والے حافظ محسن محمود ہیں جنہوں نے ساڑھے نو ماہ کی قلیل مدت میں یہ سعادت حاصل کی۔

مرکزی انجمن کے اہم شعبہ "مکتبہ" کا ذکر کرتے ہوئے ناظم اعلیٰ نے فرمایا کہ سال ۹۵ء کے دوران مکتبہ کی کارکردگی بہت اچھی رہی۔ دوران سال =/۴,۷۲,۹۰۰ روپے کی کتب فروخت کی گئیں۔ ۲۱,۵۱۳ آڈیو کیسٹس اور ۱۴۷۴ ویڈیو کیسٹس فروخت کی گئیں۔

ناظم اعلیٰ جناب سراج الحق سید صاحب نے قرآن کالج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ دوران سال قرآن کالج میں F.A اور B.A کی کلاسز معمول کے مطابق جاری رہیں۔ F.A کا نتیجہ ۹۲.۳۷ فیصد رہا۔ کُل ۱۳ طلبہ میں سے ۱۲ پاس ہوئے۔ ان میں سے چار طلبہ نے فرسٹ ڈویژن اور آٹھ نے سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ اس سال ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کے داخلے بہت امید افزا رہے۔ اس کورس میں ۳۵ مرد اور ۱۴ خواتین نے داخلہ لیا۔ ان میں دو فیملیز کے علاوہ ایک خاتون اور ایک صاحب U.S.A سے اور ایک صاحب کینیڈا سے آئے ہیں۔ ایک سالہ کورس کو ملا کر قرآن کالج کے طلبہ کی کل تعداد ۱۵۸ ہے۔ موسم گرما کی چھٹیوں کے دوران ۳۸ طلبہ نے اسلامک جنرل نالج ورکشاپ میں حصہ لیا۔ قرآن کالج کے اساتذہ کی تعداد جو کہ ۹۴ء میں دس تھی' اس سال بڑھ کر چودہ ہو گئی۔ گویا دوران سال چار اساتذہ کا اضافہ ہوا۔ سال ۹۵ء سے BA کا اضافی سال ختم کر دیا گیا ہے۔ قرآن کالج ہاسٹل میں گزشتہ چند سال سے رہنے والے طلبہ بہت زیادہ آ رہے ہیں۔ اس مرتبہ ان طلبہ کی تعداد سو تھی۔

شعبہ خط و کتابت کورس میں شرکاء کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ فکری و عملی رہنمائی کورس میں شرکاء کی تعداد ۱۹۲۰ اور ابتدائی عربی گرامر کورس کے شرکاء کی تعداد ۱۱۵۹ ہے۔

دوران سال شعبہ سمع و بصر نے اپنی ذمہ داریاں باحسن ادا کیں۔ خصوصاً اس شعبہ نے مرکزی انجمن کی ایک تعارفی فلم تیار کی جسے شعبہ کا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔

محترم سید صاحب نے بزم ہائے خدام القرآن کے شعبہ کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ اس شعبہ کے زیر اہتمام لاہور شہر میں مختلف جگہ پر عربی کلاسز جاری رہیں۔ ماہ رمضان کے دوران دورۂ ترجمہ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔ خصوصاً محترم صدر مؤسس کا کتابچہ "قرآن مجید کے حقوق" دس ہزار کی تعداد میں تقسیم کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ علاوہ ازیں مختلف مقامات پر Get-together اور باہم تعارف کی محافل کا اہتمام کیا گیا۔

جناب ناظم اعلیٰ نے بتایا کہ انجمن کے شعبہ ایڈمن نے اپنی معمول کی دفتری ذمہ داریوں کے علاوہ انجمن کی ضروریات کے لئے گورنمنٹ اور نیمی گورنمنٹ کے اداروں سے مسلسل رابطہ جاری رکھا۔ اس شعبہ نے اپنی ذمہ داریاں احسن طور پر ادا کیں۔

شعبہ اکاؤنٹس اور کیش کا ذکر کرتے ہوئے ناظم اعلیٰ نے فرمایا کہ یہ شعبہ اپنے مختصر سٹاف کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے خصوصی طور پر انٹرنل آڈٹ کے لئے جناب رحمت اللہ بٹر صاحب اور ایکسٹرنل آڈٹ کے لئے جناب رحمٰن میر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ یہ دونوں اپنی ذمہ داریاں اعزازی طور پر ادا کر رہے ہیں۔

آخر میں جناب ناظم اعلیٰ نے بتایا کہ جامع القرآن کی توسیع کا کام جو اپریل ۹۵ء میں شروع ہوا تھا' دوران سال اس کا civil work مکمل ہو گیا ہے۔

معتمد انجمن' جناب ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے پروگرام کو آگے بڑھاتے ہوئے مرکزی انجمن کے ناظم بیت المال جناب شیخ محمد عقیل صاحب کو دعوت دی کہ وہ سال ۹۵ء کے اکاؤنٹس کی highlights پیش کریں۔ شیخ محمد عقیل صاحب نے مختصراً سالانہ اکاؤنٹس کے اعداد و شمار پیش کئے۔ ساتھ ہی انہوں نے انجمن کے بڑھتے ہوئے اخراجات اور گرتی ہوئی آمدنی پر تشویش کا اظہار کیا اور اراکین انجمن کو متوجہ کیا کہ وہ انجمن کی آمدنی میں اضافہ کے لئے بھرپور تعاون کریں۔

صدر مؤسّس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا خطاب

محترم صدر مؤسس نے اپنے خطاب کا آغاز سورۃ البیّنہ کی ابتدائی دو آیات اور سورۃ الطلاق کی آیت نمبر ۱۱۔ ۱۲ کی تلاوت سے کیا اور واضح فرمایا کہ اللہ کی کتاب اور اللہ کا رسول مل کر "البیّنہ" کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے اور ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کو گھٹانے یا اسے نظرانداز کرنے سے پورا تصورِ دین بگڑ جاتا ہے اور فکری گمراہی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ صدر مؤسّس نے فرمایا کہ صرف ۲۳ برس کی مختصر مدت میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دینا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بے مثال کارنامہ ہے جس کی پوری انسانی تاریخ میں اور کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس عظیم انقلابی جدّوجہد میں "آلۂ انقلاب" کی حیثیت قرآن حکیم کو حاصل تھی۔ بقول مولانا حالی۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا　　اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور بقول اقبال۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

(کہ یہ قرآن جب کسی کے دل میں اتر جاتا ہے تو اس کی زندگی میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ اور جب فرد کی زندگی میں انقلاب آتا ہے تو یہ چیز پورے جہان کی تبدیلی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے)

اور یہ "آلۂ انقلاب" آج بھی امّتِ مسلمہ کے پاس موجود ہے' مشکل یہ ہے کہ افرادِ اُمّت اس کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہیں۔ آج اسلام بحیثیتِ دین دنیا کے کسی خطے میں قائم و غالب نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ان علاقوں اور ملکوں میں بھی مغلوب و سرنگوں ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کا اولین مرحلہ یہی ہے کہ شمشیرِ قرآنی ہاتھ میں لے کر اسی طرح علمی و فکری جہاد کیا جائے جیسے مکی دور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثاروں نے جہاد بالقرآن کا عملی نمونہ پیش کیا تھا۔ اس مرحلے کو سر کئے بغیر انقلاب کے خواب دیکھنا خود فریبی

کے سوا اور کچھ نہیں!

صدر مؤسس نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ وہ خواب جو علامہ اقبال نے "دارالاسلام" کی صورت میں دیکھا تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے "دارالارشاد" کے قیام کے ذریعے جس خواب کی عملی تعبیر دیکھنے کی آرزو کی تھی' اللہ تعالیٰ نے صدر مؤسس اور مرکزی انجمن کی مساعی کو شرفِ قبول عطا فرماتے ہوئے ان کے ذریعے اس خواب کی عملی تعبیر ظاہر فرمادی۔

قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج جیسے اداروں کا قیام جہاں سے سینکڑوں گریجویٹس اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان دو سالہ اور ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کرکے اب دروس و تقاریر کے ذریعے قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے میں مصروف ہیں' اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اللہ نے اس کام کو قبول فرمالیا ہے۔ ان اداروں کے ذریعے بحمداللہ اس وسیع خلیج کو پاٹنے کا سامان فراہم ہو گیا جو ہمارے یہاں رائج دو مختلف نظام ہائے تعلیم کے باعث بتدریج وسیع تر ہو رہی تھی اور جسے پاٹنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس غلط نظام تعلیم کے باعث مدارسِ دینیہ سے فراغت حاصل کرنے والے طلبہ علومِ جدیدہ سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ طلبہ دینی علوم سے بالکل بے گانہ ہوتے ہیں۔ ان کے قلوب و اذہان پر چونکہ دورِ جدید کے باطل نظریات اور افکار کا تسلط ہوتا ہے لہٰذا وہ قرآن کو محض ایک موروثی عقیدے کی بنا پر اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں' قرآن کی تعلیمات اور اس کے فکر و فلسفہ پر انہیں اطمینانِ قلبی حاصل نہیں ہوتا۔ صدر مؤسس نے اس امر پر اللہ کا خصوصی شکر ادا کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا کہ قرآن کالج اور قرآن اکیڈمی سے دینی کورس مکمل کرنے والے طلبہ اس تضادِ فکری کا شکار نہیں ہیں بلکہ وہ قرآن حکیم پر "مطمئن" ہو کر یہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ "رجوع الی القرآن" کا ایک مرحلہ اللہ نے ہمارے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے۔

انجمن کی مجلس شوریٰ کے نصف ارکان کا انتخاب

صدر مؤسس کے خطاب کے بعد نماز عشاء باجماعت ادا کی گئی اور اس کے بعد حسب پروگرام مجلس شوریٰ کے نصف ارکان کے انتخاب کے لئے کارروائی کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اب ناظم انتخاب محترم محمد بشیر ملک صاحب نے ڈائس سنبھالا اور سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

"معزز اراکین مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اس دفعہ داستان انتخاب کچھ مختلف اور مختصر سی ہے۔ مختلف اس لئے کہ اس دفعہ صرف نصف اراکین مجلس شوریٰ کا انتخاب ہونا ہے اور مختصر یوں کہ انتخاب کے ابتدائی مراحل کے بعد بقیہ مراحل سے گزرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ

مجلس شوریٰ نے اپنے ۱۷/ نومبر ۹۵ء کے اجلاس میں جہاں انجمن کے آئندہ سالانہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی وہاں دستور کی دفعہ ۳ (و) (۲) کے مطابق مجلس شوریٰ سے دستبردار ہونے والے نصف ارکان کا تعین بھی بذریعہ قرعہ اندازی کر لیا۔ اس طرح جو حضرات دستبردار ہوئے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حلقہ نمبرا مؤسسین اور محسنین میں سے

۱ ۔ جناب سراج الحق سید صاحب
۲ ۔ جناب چوہدری شہباز الدین صاحب
۳ ۔ جناب ڈاکٹر عارف رشید صاحب
۴ ۔ جناب قمر سعید قریشی صاحب
۵ ۔ جناب لطف الرحمٰن خان صاحب
۶ ۔ راقم الحروف محمد بشیر ملک
۷ ۔ جناب وقار احمد صاحب

حلقہ نمبر۲ مستقل ارکان میں سے

۱ ۔ جناب احسن الدین صاحب
۲ ۔ جناب ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب

حلقہ نمبر۳ عام ارکان میں سے

۱۔ جناب الطاف حسین صاحب ۲۔ جناب میجر خاور قیوم صاحب

۳۔ جناب چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب ۴۔ جناب غازی محمد وقاص صاحب

۲۔ مجلس شوریٰ کے نومبر ۹۵ء ہی کے اجلاس میں راقم الحروف کو ناظم انتخاب مقرر کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ فارغ ہونے والے ممبران مجلس شوریٰ کی خالی نشستوں کو پُر کرنے کے لئے انتخابات کا اہتمام کیا جائے۔ نیز یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ رائے دہی کا حق صرف ان وابستگان انجمن کا محفوظ ہو گا جو اپنا ماہانہ زر تعاون ۳۱ دسمبر ۹۵ء تک ادا کر دیں۔

چنانچہ راقم الحروف نے اپنے خط مورخہ ۶ جنوری ۱۹۹۶ء کے ذریعے تمام وابستگانِ انجمن سے رابطہ قائم کیا جس میں دیگر امور کے علاوہ ان سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء تک کے واجبات ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء تک ادا کر دیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۶ء کو جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ حلقہ نمبر۱ مؤسسین اور محسنین' حلقہ نمبر۲ مستقل ارکان اور حلقہ نمبر۳ عام ارکان میں سے علی الترتیب ۱۴. ۲۴' ۸۱. ۲۳ اور ۱۹ فیصد وابستگان انجمن نے اپنے واجبات ادا کئے ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہ یہ یقیناً مایوس کن تھی' واجبات کی ادائیگی کی آخری تاریخ میں ۲۹ فروری ۱۹۹۶ء تک توسیع کر دی گئی اس توسیع شدہ تاریخ کے گزرنے کے بعد پھر جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ حلقہ نمبر۱' حلقہ نمبر۲ اور حلقہ نمبر۳ کے اراکین میں سے علی الترتیب ۳۰ فیصد' ۷۲ فیصد اور ۲۱ فیصد حضرات نے ۳۱ دسمبر ۹۵ء تک کے واجبات ادا کئے ہیں۔

اس عدم تعاون کی وجوہات کیا ہیں اس پر کچھ عرض کرنے سے میں معذور رہوں کیونکہ یہ میرے دائرہ کار میں نہیں۔

انتخاب کے دوسرے مرحلے کی تیاری میں ان حضرات کی فہرستیں مرتب کی گئیں جو مجلس شوریٰ کی خالی نشستوں کو پُر کرنے کے لئے تجویز ہو سکتے تھے اور یہ فہرستیں مناسب تعداد میں قرطاسِ تجویز کے ساتھ ان وابستگانِ انجمن کو ارسال کر دی گئیں جن کا حقِ رائے دہی محفوظ تھا۔ یہ فہرستیں اور قرطاس تجویز ۷ مارچ ۱۹۹۶ء کو ارسال کی گئیں۔ اس مراسلے میں تجویز کنندگان سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ قرطاس تجویز مکمل کر کے ناظم انتخاب کو ۲۱

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

سیرت وسوانح

امام مسلم بن حجاجؒ

عبدالرشید عراقی

محدثین صحاح ستہ میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کے بعد دوسرے نمبر پر امام مسلم بن حجاج کا نام آتا ہے۔ آپ کا لقب عساکر الدین اور کنیت ابوالحسین تھی۔ آپ ۲۰۴ھ میں خراسان کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ {۱}

جس دور میں آپ پیدا ہوئے' اس دور میں علم حدیث صحابہؓ و تابعینؒ کے سینوں سے نکل کر مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اور محدثین کرام کی ایک کثیر تعداد صفحۂ ہستی پر موجود تھی۔ نیشاپور ان دنوں علم و فن کا مرکز اور محدثین کرام کا مسکن تھا۔

علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ

"نیشاپور اس قدر بڑے عظیم الشان شہروں میں سے تھا کہ بغداد کے بعد اس کی نظیر نہ تھی۔" {۲}

ابتدائی تعلیم

امام مسلم نے ابتداءً امام اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۸ھ) سے نیشاپور میں استفادہ کیا {۳}

سماع حدیث کے لئے سفر

نیشاپور میں امام اسحاق بن راہویہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد امام مسلم نے سماع حدیث کے لئے عراق' حجاز' مصر اور شام کے سفر کئے۔ اور ہر جگہ اساطینِ فن سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ بغداد (عراق) متعدد بار تشریف لے گئے اور یہاں کا آخری سفر آپ نے ۲۵۹ھ میں کیا' جس کے دو سال بعد ۲۶۱ھ میں آپ انتقال فرما گئے۔ {۴}

اساتذہ و تلامذہ

آپ کے اساتذہ میں امام اسحاق بن راہویہ' امام محمد بن اسمٰعیل بخاری' امام احمد بن حنبل جیسے کبار محدثین شامل ہیں۔ اور تلامذہ میں امام ابو عیسیٰ ترمذی' امام ابن خزیمہ اور امام ابو حاتم رازی جیسے اکابر محدثین شامل ہیں۔ {۵}

امام مسلم کے علم و فضل کا اعتراف

امام مسلم کے علم و فضل' عدالت و ثقاہت' زہد و ورع اور امانت و دیانت کا اعتراف آپ کے معاصرین ہی نے نہیں بلکہ آپ کے اساتذہ کرام نے بھی کیا ہے۔ آپ کے استاد امام اسحاق بن راہویہ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی :

ایّ رجلٍ یکون ھٰذا "خدا جانے کس پائے کا یہ شخص ہو گا!" {۶}

امام نووی (م ۶۷۶ھ) لکھتے ہیں :

"امام مسلم کی جلالت و عظمت شان اور امامت پیشوائے فن ہونے پر امتِ مسلمہ کا اجماع و اتفاق ہے"۔ {۷}

اخلاق و عادات

امام مسلم نے پوری زندگی نہ کسی کی غیبت کی اور نہ سب و شتم کیا {۸}۔ اپنے اساتذہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ خاص طور پر امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کے علم و فضل اور ان کے زہد و ورع کے بہت معترف تھے۔ ایک دفعہ آپ امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور فرمایا : "میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ کی مثل اس دنیا میں کوئی نہیں"۔ {۹}

آپ امام بخاری کے بارے میں کوئی معمولی سی بات بھی جو امام صاحب کی مخالفت میں جاتی ہو' سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ

"جب نیشاپور میں امام بخاری پر مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں ہجوم ہونے لگا تو حاسدین نے حسد کیا۔ اور مخالفت میں امام ذہبی بھی شامل ہو گئے اور اپنی مجلس میں اعلان کر دیا :

"الامن کان یقول بقول البخاری فی مسئلة اللفظ

بالقرآن فلیتعزل مجلسنا"

تو امام مسلم فوراً امام ذہبی کی مجلس سے اٹھے' اور ان سے مسموعہ روایات کے تمام مسودے ان کو واپس کر دیئے۔ اور ان سے بالکلیہ روایت کرنا ترک کر دیا"۔ {۱۰}

امام مسلم کا مسلک

امام مسلم کے مسلک کے بارے میں علمائے کرام میں اختلاف ہے۔ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

"امام مسلم اور امام ابن ماجہ کا مذہب معلوم نہیں ہے' اس لئے کہ انہوں نے صحیح مسلم کے ابواب خود قائم کئے ہیں۔ اس سے ان کے مذہب کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا" {۱۱}

مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) نے امام مسلم کا مسلک شافعی لکھا ہے {۱۲}۔ مولانا عبدالرشید نعمانی نے آپ کو مالکی مذہب میں شمار کیا ہے {۱۳}۔ علامہ طاہر الجزائری کہتے ہیں کہ

"امام مسلم اصولی طور پر شافعی تھے' انہوں نے امام شافعی سے بہت کم اختلاف کیا ہے" {۱۴}۔

وفات

امام مسلم کی پوری زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ حیرت انگیز ہے۔ ایک دن مجلس درس میں ایک حدیث کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا جو اس وقت امام صاحب کو یاد نہ تھی۔ گھر آ کر اس حدیث کو تلاش کرنے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ سامنے رکھے ہوئے تھیلے میں سے خرمے اٹھا اٹھا کر کھانے لگے۔ حدیث کی تلاش میں اس قدر محو ہوئے کہ آہستہ آہستہ تمام خرمے کھا گئے۔ اور حدیث بھی مل گئی۔ خرموں کے کھانے کا منفی اثر ہوا' جو آپ کی موت کا سبب ہوا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۵ سال تھی {۱۵}۔

تصانیف

امام مسلم نے جو کتابیں تصنیف کیں وہ حسب ذیل ہیں :

المسند الکبیر' کتاب الاسماء والکنی' الجامع الکبیر' کتاب العلل' کتاب الوحدان' کتاب

الاقران 'کتاب سوالات لاحمد 'کتاب حدیث عمرو بن شعیب 'کتاب الانتفاع باھب السباع' کتاب مشائخ مالک 'کتاب مشائخ الثوری 'کتاب مشائخ شعبہ 'کتاب من لیس لہ الا راد واحد 'کتاب المخضرمین 'کتاب اولاد الصحابہ 'کتاب اوھام المحدثین 'کتاب الطبقات 'کتاب افراد الشامین 'کتاب رواۃ الاعتبار 'الجامع الصحیح المسلم {۱۶}

مختصر تعارف الجامع صحیح مسلم

امام مسلم کی تصانیف میں سب زیادہ شہرت و مقبولیت الجامع صحیح مسلم کو حاصل ہوئی۔ احادیث کے سلسلہ میں سب سے پہلے امام بخاری (م۲۵۶ھ) نے الجامع الصحیح کے نام سے ایک مجموعہ مرتب فرمایا۔ اس کو دیکھ کر امام مسلم نے بھی احادیث صحیحہ کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام مسلم امام بخاری کے شاگرد تھے اور امام بخاری سے امام مسلم نے بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کو مرتب کرتے وقت احادیث مرفوعہ کی تخریج کو پیش نظر رکھا اور اس کے ساتھ انہوں نے موقوف و معلق' صحابہ و تابعین کے فتاویٰ بھی نقل کئے ہیں۔ لیکن امام مسلم نے اپنی کتاب میں صرف صحیح احادیث کو جمع کیا ہے اور صرف وہ صحیح احادیث جن کی صحت پر مشائخ وقت کا اتفاق تھا۔ چنانچہ امام مسلم فرماتے ہیں :

"ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں درج نہیں کیا' میں نے یہاں صرف ان احادیث کو درج کیا ہے جن کی صحت پر شیوخ وقت کا اجماع ہے۔ {۱۷}

امام مسلم نے اپنی یہ مایہ ناز کتاب ۱۵ سال میں مکمل کی۔ {۱۸}

تعداد روایات

امام مسلم نے تین لاکھ صحیح احادیث سے انتخاب کر کے اپنی صحیح کو مرتب فرمایا۔ صحیح مسلم میں احادیث کی تعداد چار ہزار ہے۔ {۱۹}

صحیح مسلم کا مرتبہ و مقام

کتب احادیث میں صحیح مسلم کا مرتبہ و مقام کیا ہے' اس کے بارے میں امام نووی

فرماتے ہیں :

"کتاب اللہ کے بعد صحیحین (بخاری و مسلم) کا مرتبہ ہے۔ اور امت نے ان دونوں کتابوں کی تلقی بالقبول کی ہے' البتہ صحیح بخاری دیگر فوائد و معارف کے لحاظ سے سب سے فائق اور ممتاز ہے" {۲۰}۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (م ۱۹۴۹ء) لکھتے ہیں :

"صحیح بخاری کا امام مسلم کی کتاب صحیح مسلم پر من حیث الصحت راجح و مقدم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف بڑے بڑے ناقدین فن نے کیا ہے"۔ {۲۱}

محی السنہ مولانا سید نواب صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں :

"واقع است اجماع بر تلقی ایں ہر دو کتاب بالقبول والتسلیم زیرا کہ شیخین مقدم اند بر ائمۂ عصر مابعد در معرفت علل و غوامض ایں"۔ {۲۲}

(صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر تلقی بالقبول اور تسلیم عام حاصل ہے کیونکہ امام بخاری و مسلم اپنے زمانے اور مابعد کے ائمہ پر احادیث کے علل اور اس کی باریکیوں کی معرفت و تمیز میں سب پر مقدم و فائق تھے۔)

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۸ھ) کا ایک قول مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم کے مقدمہ میں درج کیا ہے کہ :

"حسن ترتیب کے لحاظ سے صحیح مسلم کا مقام بہت بلند ہے یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اسے صحیح بخاری پر بھی اچھالا ہے" {۲۳}

مقدمہ صحیح مسلم

صحیح مسلم کا سب سے زیادہ قابل قدر اس کا مقدمہ ہے۔ اس مقدمہ میں وجہ تالیف کے علاوہ فن روایت کے بہت سے اصول اور فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ تفسیر' فقہ' اصول فقہ' ادب' نحو' یہ سب مسلمانوں کے مذہبی علوم ہیں۔ اس لئے مسلمانوں نے ان سب میں کمال پیدا کیا۔ تاہم علم حدیث چونکہ مذہب کا سب سے زیادہ ضروری عنصر تھا اس لئے یہ مقدس فن ایک مدت تک مسلمانوں کے دل و دماغ کی جولانگاہ بنا رہا۔ مگر نااہل اور خود غرض لوگوں کی ایک جماعت نے اس فن کو نام و نمود کا ذریعہ قرار دے کر موضوع اور غیر معتبر

روایات کا ایک طومار کھڑا کر دیا۔ چنانچہ محدثین کرام نے اس سلسلہ میں کافی محنت کی اور غیر معتبر روایات اور موضوع احادیث کو الگ کر دیا۔

اہل علم نے مقدمہ صحیح مسلم کی متعدد شرحیں لکھی ہیں۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (م ۱۳۲۹ھ) اور مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری (م ۱۳۳۷ھ) نے مقدمہ صحیح مسلم کی شرحیں لکھی تھیں' مگر یہ دونوں شرحیں طبع نہیں ہو سکیں {۲۴}

صحیح مسلم کی شروح

صحیح مسلم کی بہت سی شروح و حواشی اور مستخرجات لکھے گئے۔ تاہم چند مشہور شروح حسب ذیل ہیں :

(۱) المنهاج فی شرح صحیح مسلم بن حجاج 'از نوویؒ
(۲) اکمال المعلم فی شرح صحیح مسلم 'از قاضی عیاض مالکیؒ
(۳) الدیباج علی صحیح مسلم بن حجاج 'از علامہ سیوطیؒ
(۴) السراج الوهاج 'از مولانا نواب صدیق حسن خانؒ
(۵) مختصر صحیح مسلم 'از عبدالعظیم منذریؒ
(۶) فتح الملهم 'از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ و مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ کراچی
(۷) المعلم فی شرح صحیح مسلم از مولانا وحید الزمانؒ حیدر آبادی

مختصر تعارف شرح امام نووی

امام نووی کی شرح کا نام المنهاج فی شرح صحیح مسلم بن حجاج ہے۔ اس شرح کے بارے میں امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی (م ۶۷۶ھ) فرماتے ہیں۔

"اگر لوگوں کی ہمتیں پست نہ ہوتیں تو میں اس شرح کو ایک سو جلدوں میں مکمل کرتا۔ لیکن تین جلدوں میں ختم کر دیا۔ {۲۵}

اس شرح کے شروع میں ایک مقدمہ طالبان حدیث کے لئے بہت مفید ہے۔

امام نووی کی اس شرح کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ شرح نہ تو مطول و

مفصل ہے اور نہ بہت مختصر و مجمل بلکہ متوسط ہے۔ اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے۔ اس میں صحیحین خصوصاً صحیح مسلم کی اہمیت و خصوصیت' امام مسلم کی حدیث میں عظمت و برتری' غیر معمولی احتیاط و کاوش اور دقت نظر کے علاوہ اصول روایت اور فن حدیث کے علاوہ اصول حدیث فقہ و احکام' تفسیر و تاریخ' کلام و عقائد' سیر و تراجم' رجال و انساب' لغت و ادب' صرف و نحو' اعراب و امالی اور قراءت و تجوید کے مسائل و مباحث بھی تحریر کئے گئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہر فن کی کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔{۲۶}

امام نووی شافعی المذہب تھے' اور بعض علمائے کرام نے یہ تصریح کی ہے کہ ان کو شافعیت میں غلو تھا۔ اس لئے وہ مذہب شافعی کو شرح میں زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں اور اس کو قوی اور راجح قرار دیتے ہیں' لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

محی السنہ مولانا نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں :

ومنزہ بود از تعصب شافعیت و متصف بانصاف و نقل می کرد در کتب خود از اقوال ابو حنیفہ {۲۷}

"شافعی مذہب کے عصبیت سے پاک اور انصاف پسند تھے۔ اور اپنی کتابوں میں امام ابو حنیفہ کے اقوال بھی نقل کرتے تھے"۔

برعظیم پاک و ہند میں صحیح مسلم کا جو نسخہ متداول ہے وہ شرح نووی کے ساتھ ہی طبع ہوتا ہے۔

---

(۱) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۲' ص ۱۶۵۔ (۲) سبکی' طبقات الشافعیہ' ج ۱' ص ۱۷۳۔
(۳) ابن خلکان' وفیات الاعیان' ج ۲' ص ۱۳۵۔ (۴) ابن خلکان' وفیات الاعیان' ج ۲' ص ۱۳۵۔
(۵) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۲' ص ۱۶۵۔ (۶) ابن کثیر' البدایہ والنہایہ' ج ۱۱' ص ۳۵۔
(۷) نووی' تہذیب الاسماء' ج ۲' ص ۹۰۔ (۸) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۲' ص ۱۶۶۔
(۹) ابن حجر' مقدمہ فتح الباری' ص ۴۸۵ (۱۰) ابن کثیر' البدایہ والنہایہ' ج ۱۱' ص ۳۴۔
(۱۱) محمد انور کشمیری' فیض الباری' ج ۱' ص ۱۸۳۔ (۱۲) صدیق حسن خان الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ' ص ۹۸۔ (باقی صفحہ ۵۵ پر)

روداد محاضرات

"جدید انسان' ورائے جدیدیت کی دہلیز پر"

مرکزی انجمن کے زیر اہتمام ۱۹ تا ۲۱/ اپریل ۹۶ء منعقد ہونے والے سالانہ محاضراتِ قرآنی کی ایک بھرپور رپورٹ

مرتب : ڈاکٹر احمد افضال

حکمت قرآن کے قارئین اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سالانہ "محاضراتِ قرآنی" اب لاہور کی علمی زندگی کا جزوِ لاینفک اور دعوت رجوع الی القرآن کی مستقل روایت بن چکے ہیں۔ اس سال محاضرات قرآنی کے سلسلے میں تنظیم اسلامی کے رفیق جناب باسط بلال کوشل صاحب نے قرآن آڈیٹوریم میں تین خطبے دیئے۔ یہ تینوں خطبے حسب اعلان انگریزی زبان میں ہوئے۔ تاہم سامعین کے ذوق و شوق اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ تینوں دن قرآن آڈیٹوریم اپنی تمامتر وسعت کے باوجود تنگ پڑتا دکھائی دیتا تھا۔ بحمد اللہ یہ ایک نہایت کامیاب اور مفید پروگرام تھا جس کی افادیت کا اعتراف متعدد قابل ذکر حلقوں کی جانب سے ہوا۔

باسط بلال ایک نوجوان اسکالر ہیں (ان کی عمر ابھی صرف ۲۸ سال ہے)' جو اگرچہ پاکستان میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تعلیم امریکہ میں ہوئی ہے۔ انہوں نے William Paterson College سے سیاسیات میں ایم ۔ اے کیا اور Hartford Seminary سے اسلامیات میں ایم۔اے کی سند حاصل کرنے والے ہیں۔ جناب باسط بلال Drew University سے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں' نیز قرآن کالج لاہور سے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس بھی کر چکے ہیں۔ ان کے تعارف میں قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر ابصار احمد نے رڈیارڈ کپلنگ کا قول دہراتے ہوئے کہا کہ اگرچہ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ مشرق اور مغرب دو جداگانہ حقیقتیں ہیں جن میں کبھی ملاپ نہیں ہو سکتا' لیکن حاضرین کے سامنے باسط بلال کی شکل میں ان دو

مختلف روایات کا سنگم موجود ہے۔ یعنی وہ ایک ایسے سکالر ہیں جن کی تعلیم و تربیت اور بولنے کا انداز پوری طرح مغربی ہے' لیکن ان کے دل و دماغ پر اصل اسلامی اثرات شدت کے ساتھ راسخ ہیں۔

جناب باسط بلال کے خطبات کا مرکزی خیال یہ تھا کہ فکر و عمل کے جس مجموعے کا نام "جدیدیت" یا "Modernity" ہے' اس کا دور اب اختتام کے قریب آ چکا ہے' اور جدید انسان "ورائے جدیدیت" یا "Post-Modernism" کے دور میں قدم رکھنے والا ہے۔ تاہم ابھی تک یہ واضح نہیں ہے کہ یہ "ورائے جدیدیت" عہد نطشے کے فلسفے کی بنیاد پر قائم ہو کر دہریت کا نمونہ پیش کرے گا یا اقبال کی تعلیمات کی پیروی میں عرفانِ خودی اور خدا پرستی کا راستہ اختیار کرے گا۔

☆ ☆ ☆

پہلا خطبہ ۱۹/ اپریل کو پیش کیا گیا اور جامعہ پنجاب کے صدر شعبہ سیاسیات پروفیسر سجاد نصیر صاحب نے صدارت کی۔ اس خطبے کا عنوان تھا "جدید ذہن کے عقائد اور ان کی الجھنیں"۔ جناب باسط بلال نے کہا کہ ان کے خطبات کا اصل مقصد یہ ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد نے جو خیالات اپنے مختصر کتابچے "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" میں پیش کئے ہیں' ان کو مزید وسعت دی جائے اور انہیں مغرب کے دانشور طبقے تک پہنچایا جا سکے۔ انہوں نے "جدیدیت" کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ دراصل تین عقائد کے مجموعے نے جس ذہنی فضا اور سوچنے کے طریقے کو جنم دیا ہے اسے "جدیدیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ تین عقائد ہیں' سائنس پرستی یا Scientism' لادینیت یا Secularism اور سرمایہ داری یا Capitalism۔ ان تینوں نظریات کو عقائد قرار دینا اس لئے درست ہے کہ موجودہ اندازِ فکر میں فی الواقع ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی مذہب میں عقیدے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ جدید ذہن نے ان تینوں اقدار کو کسی تنقید کے بغیر اختیار کر کے حرزِ جاں بنایا ہوا ہے۔ اگرچہ ان عقائد کو اکثر سائنسی انداز میں بیان کیا جاتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں کی حیثیت موضوعی مفروضوں کی ہے' نہ کہ

معروضی حقائق کی۔

سائنس پرستی اور سائنس دو مختلف چیزیں ہیں۔ سائنس دراصل مادی کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے لئے ایک مخصوص طریقے سے کوشش کرنے کا نام ہے' جبکہ سائنس پرستی جدید ذہن کا یہ دعویٰ ہے کہ علم صرف وہی ہے جو سائنس کے ذریعے حاصل کیا جائے' اور سائنس کے سوا کسی بھی ذریعے سے حاصل ہونے والا علم توہمات کی فہرست میں رکھنا چاہئے۔ اس طرح گویا وحی' روحانی تجربے' اور وجدان کی کامل نفی کردی گئی۔ اگر آپ یہ کہیں کہ سائنس علم کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے تو اس سے مذہب پر کوئی زد نہیں پڑتی' لیکن سائنس پرستی کے مطابق سائنس حصول علم کا واحد ذریعہ ہے' اور ظاہر ہے کہ یہ نظریہ مذہب کی تعلیمات کے برعکس ہے۔

عمرانیات کے میدان میں جدیدیت نے لادینیت (Secularism) کو اختیار کیا ہے۔ لادینیت اپنی اصل کے اعتبار سے مذہب کا انکار نہیں کرتی' بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ مذہب افراد کا ذاتی اور نجی معاملہ ہے اور اسے معاشرے سے یا ریاست کی سطح پر امورِ اجتماعی میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

تیسرا عقیدہ سرمایہ داری (Capitalism) کا ہے۔ جدیدیت نے سرمایہ داری کو بطور نظریۂ حیات (Ideology) اختیار کیا ہوا ہے۔ نظریۂ حیات سے مراد دلائل و براہین کا وہ مجموعہ ہے جسے انسانوں کا کوئی گروہ اپنے رویئے کو خود اپنی نظروں میں درست ثابت کرنے کی غرض سے استعمال کرتا ہے۔ جدیدیت نے سرمایہ داری کو اپنی Ideology بنایا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی رو سے ہر انسان کی بنیادی خواہش زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھا کرنا ہے' اور معاشرے کا مجموعی مفاد اس میں ہے کہ ہر فرد کو اپنے خود غرضانہ مفاد کے لئے کوشش کرنے کی پوری آزادی دی جائے۔

جناب باسط بلال نے کہا کہ مغربی معاشرے میں جو زبردست حرکت اور رونق (dynamism) نظر آتی ہے وہ اصل میں سرمایہ داری کی مرہونِ منت ہے' اور خود سرمایہ داری کا جوش و خروش سودی نظام بینکاری کے دم سے ہے۔ جدیدیت کے عقائد سہ گانہ کے متعلق جناب باسط بلال نے حاضرین کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ اگرچہ

اٹھارہویں صدی میں Romanticism نے سائنس پرستی کے رجحان کو چیلنج کیا تھا' اور انیسویں صدی میں اشتراکیت نے سرمایہ داری کو چیلنج کیا تھا' تاہم مغرب میں آج تک کوئی تحریک یا نظریہ ایسا نہیں ابھرا جس نے لادینیت یعنی Secularism کے مقابلے میں آنے کی کوشش کی ہو۔ انہوں نے کہا کہ بحیثیتِ مجموعی جدیدیت کے تینوں ستون اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں' اور بعض علمی حلقوں کا یہ دعویٰ درست معلوم نہیں ہوتا کہ "ورائے جدیدیت" یا Post-Modernism کا دور شروع ہو چکا ہے۔

فاضل مقرر نے کہا کہ جدیدیت کے عقائدِ سہ گانہ میں وہ زہر چھپا ہوا ہے کہ جس معاشرے نے بھی انہیں قبول کیا وہ تصوریت (Idealism)' روحانیت (Spirituality)' مابعد الطبیعیات (Metaphysics) اور کسی ماورائے حواس حقیقت (Transcendentalism) پر ایمان رکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ نتیجتاً تمام تر توجہات کا ارتکاز خدا کی ذات کے بجائے مرئی اور محسوس کائنات پر' روح کے بجائے جسمِ حیوانی پر' اور عالمِ اخروی کے بجائے موجودہ عارضی وفانی زندگی پر ہو گیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ آج تک جتنی بھی تہذیبیں دنیا میں رہی ہیں' ان میں سے ہر ایک نے مرئی و محسوس مادی عالم کے بجائے ایک غیر مرئی اور ماورائے حواس عالم کو اہمیت دی ہے۔ موجودہ جدید معاشرہ واحد استثناء ہے' کیونکہ اس کی تمام تر توجہ صرف مادے پر جم کر رہ گئی ہے اور جو نہ صرف کسی بھی نوعیت کی روحانیت کا منکر ہے بلکہ اس کے خلاف کھلی دشمنی کا رویہ رکھتا ہے۔

فاضل مقرر نے واضح کیا کہ جدیدیت کے عقائدِ سہ گانہ کا مؤثر ابطال کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم ان پر تنقید کرتے ہوئے کوئی ایسا ذریعہ استعمال نہ کریں جو جدید ذہن خود تسلیم نہیں کرتا' مثلاً لادینیت کے رد کے لئے کسی آسمانی کتاب کا حوالہ دینا مفید نہیں ہو گا' بلکہ ضروری ہے کہ ہم عقل و منطق کے انہی ہتھیاروں کو استعمال کریں جو خود جدید ذہن کے نزدیک مسلّم ہیں۔

سائنس پرستی کے متعلق فاضل مقرر نے کہا کہ خود سائنس اس عقیدے کو غلط ثابت کر چکی ہے۔ انہوں نے آسٹریا کے ریاضی دان Gödel کے حوالے سے بتایا کہ ریاضی میں

کسی دعویٰ کو محدود الفاظ میں اس طرح مکمل طور پر بیان کر دینا ممکن نہیں ہے کہ بیان کے تمام اجزاء آپس میں ہم آہنگ ہوں۔ اس Theorem کے جو نتائج نکلتے ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ سائنس کبھی ایسا تجرباتی طریقہ ایجاد نہیں کر سکتی جس کی مدد سے کسی بھی دعویٰ کو حتمی اور یقینی طور پر ثابت کیا جا سکے۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ (منطقی اثباتیت کے خیال کے برعکس) بہت سے ایسے جملے بامعنی ہو سکتے ہیں جنہیں سائنس یا ریاضی کی مدد سے صحیح یا غلط ثابت کیا جانا ممکن نہ ہو۔ تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ ماورائے حواس بھی ایک دنیا ہے جو اپنی جگہ اتنی ہی حقیقی و واقعی ہے جس قدر ہماری یہ مادی دنیا' لیکن اس بات کو سائنس اور ریاضی کی رو سے نہ تو کبھی درست ثابت کیا جا سکے گا اور نہ غلط ثابت کیا جا سکے گا۔

لادینیت کے متعلق فاضل مقرر نے کہا کہ بدقسمتی سے سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں جو خونریزی معاشی و سیاسی محرکات کی بنا پر کی گئی اسے مذہب یا مذہبی اختلافات کا لبادہ پہنا دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تلخ تجربے کے بعد مغرب کے سیاست دانوں اور دانشوروں نے طے کیا کہ حکومت کو دستوری طور پر اس کا پابند کر دینا چاہئے کہ وہ ایک مذہب کو دوسرے پر ترجیح نہ دے سکے۔ تاہم تاریخ کی گواہی ہمارے سامنے موجود ہے کہ لادینیت سے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بانیوں میں سے جارج واشنگٹن' تھامس جیفرسن' اور جان ایڈمز کے خیالات یہ تھے کہ وہ اس نئے ملک کا دستور اس مفروضے پر بنا رہے ہیں کہ یہاں کے عوام مذہب کی حدود کی پابندی کرنے والے ہوں گے۔ ان کا پختہ نظریہ یہ تھا کہ قانون اور دستور کی بالادستی صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے کہ عوام میں ایک مضبوط اخلاقی حس موجود ہو' اور یہ اخلاقی حس صرف اور صرف مذہب سے پیدا ہوتی ہے۔

جناب باسط بلال نے کہا کہ جب مذہب کو فرد کو نجی زندگی میں مقید کر دیا جائے تو اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ اخلاق اور اخلاقی حدود کی اہمیت تسلیم کرنے کے بعد لازم ہے کہ مذہب کو اجتماعیت میں اس کا جائز مقام دیا جائے ورنہ جب اجتماعی ماحول میں بے راہ روی اور اخلاقی حدود سے تجاوز کا رجحان پیدا ہو جائے تو لامحالہ فرد کے لئے اپنی انفرادی مذہبیت کو برقرار رکھنا بھی ناممکن بن جاتا ہے۔

مشہور ماہر نفسیات کارل یونگ کا کہنا ہے کہ نفسیاتی الجھنوں کا بڑا سبب مذہب اور روحانیت پر ایمان سے محرومی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی معاشرہ بحیثیتِ مجموعی مذہبی حس سے عاری ہو جائے تو وہ بالآخر نفسیاتی توازن سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جدید معاشرے کی امتیازی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ آسودگی اور خوشحالی کے باوجود نفسیاتی امراض میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

جناب باسط بلال نے کہا کہ سرمایہ داری کا اصل ہدف زیادہ سے زیادہ دولت کمانا ہے' اور ایک سرمایہ دارانہ نظام کبھی اپنے آپ کو ایک مخصوص سطح پر برقرار رکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس منافع کے اعتبار سے آگے بڑھتے رہنے ہی میں اس کی زندگی ہے۔ چنانچہ ہر قسم کے ذرائع ابلاغ استعمال کر کے عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اصل زندگی یہی موجودہ زندگی ہے' اسے زیادہ سے زیادہ پُر آسائش بنانا ہی تمہاری اصل کامیابی ہے' موت کے بعد کوئی جزا و سزا نہیں ہے' لہٰذا جو لطف چاہئے ابھی حاصل کر لو۔ چنانچہ یہ اسی سرمایہ دارانہ فریب کا مظہر ہے کہ اشتہارات کا لمبا چوڑا سلسلہ ایجاد کیا گیا ہے' جن کے ذریعے عوام کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ خوشی اور چین و سکون کسی روحانی ذریعے سے نہیں بلکہ نت نئی مصنوعات خریدنے سے ملتا ہے۔

اپنے خطبے کے آخر میں جناب باسط بلال نے کہا کہ معاشرے کا عام خلفشار اور افراتفری یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایک دور (یعنی جدیدیت) ختم ہو رہا ہے اور ایک نئے زمانے (یعنی ورائے جدیدیت) کی آمد آمد ہے۔ ولادت اور موت دونوں کے لئے اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ عالمِ پیر کی موت اور ایک جہانِ نو کی پیدائش بھی آسانی سے ہو جانے والے واقعات نہیں ہیں۔

☆ ☆ ☆

دوسرا خطبہ ۲۰/ اپریل کو پیش کیا گیا اور جناب زیڈ اے سلہری صاحب کی ناسازیٔ طبع کے باعث تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کے امیر جناب عطاء الرحمٰن نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ اس خطبے کا عنوان تھا "ورائے جدیدیت کے امکانات : نطشے یا اقبال؟"

اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے جناب باسط بلال نے کہا کہ جدیدیت نے سب سے بڑا نقصان جو انسانیت کو پہنچایا ہے وہ انسان کی اپنے آپ سے اور دوسرے انسانوں سے بڑھتی ہوئی مغائرت (alienation) ہے۔ اس بے گانگی اور اجنبیت کا مظہر ہے کہ انسان روز بروز ایک جانور یا مشین بنتا جا رہا ہے اور انسان کا انسان سے رشتہ کٹ کر رہ گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکی دانشور Francis Fukuyama نے اپنی کتاب "End of History and theLast Man" میں دعویٰ کیا ہے کہ انسان کا سماجی و عمرانی ارتقاء اپنی آخری منزل کو پہنچ کر مکمل ہو چکا ہے۔ موجودہ مغربی معاشرے کی اقدار وہ سب سے اونچی اور اعلیٰ ترین اقدار ہیں جن سے بلند اقدار کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ موجود آزاد جمہوری سرمایہ دارانہ نظام وہ اعلیٰ ترین نظام ہے جس سے بہتر نظام کا آنا ممکن نہیں۔ اب صرف موجودہ نظام کی توسیع ہو گی یہاں تک کہ پوری دنیا پر اسی نظام کا غلبہ ہو جائے گا۔

فوکویاما کہتا ہے کہ جب پوری دنیا پر آزاد جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کا غلبہ ہو جائے گا تو اس وقت دنیا کا "آخری آدمی" ابھرے گا' یعنی انسان اپنے ارتقاء کے اعتبار سے مکمل ترین صورت میں سامنے آئے گا۔ اس "آخری آدمی" کی خصوصیت یہ ہو گی کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک "کتا" بن جائے گا۔ کتے کا جو وصف فوکویاما کے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ جب تک اسے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا رہے اور کوئی اسے تنگ نہ کرے تو وہ اطمینان سے اونگھتا رہتا ہے۔ چنانچہ انسان کی اعلیٰ ترین منزل وہ یہ قرار دیتا ہے کہ انسان دوبارہ ایک جانور کی سطح پر زندہ رہنا سیکھ لے۔

مغرب کے بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کا مادی جسم اس کے ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے' اور انسان کے ارتقاء کے عمل کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس جسم سے نجات حاصل کی جائے۔ وہ اب یہ تصور پیش کر رہے ہیں کہ مستقبل میں زندگی ایک احساس رکھنے اور سوچنے سمجھنے والے کمپیوٹر کی صورت میں ظاہر ہو گی' جو موجودہ انسان سے بہت بہتر ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان ایسا ذہنی رویہ اختیار کر لیتا ہے جس میں روحانیت اور مابعد الطبیعیات کا کوئی دخل نہ ہو تو محض مادہ پرستی باقی رہ جاتی ہے۔ یہ اسی مادہ پرستی کا نتیجہ

ہے کہ انسان کی اپنی اصل حقیقت سے مغائرت اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ وہ ایک جانور یا مشین بن جانے کو اپنی اعلیٰ ترین منزل سمجھ رہا ہے۔ اس مادہ پرستی کا یہ نتیجہ بھی نکلا ہے کہ انسان کو مادی کائنات کا اسی طرح جزو سمجھ لیا گیا جس طرح حیوانات ہیں' چنانچہ کائنات میں انسان کا کوئی غیر معمولی رتبہ یا مقام سرے سے خارج از بحث ہو گیا۔

جناب باسط بلال نے کہا کہ اگر انسان کو اپنی انسانیت کی حفاظت کرنا ہے تو اسے جدیدیت کے خلاف بغاوت کرنا پڑے گی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بغاوت لازماً ہو کر رہے گی' لیکن اسے دو میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنا ہو گی : ایک راستہ یہ ہے کہ انسان نطشے کے مشورے پر عمل کر کے فوق البشر (Superman) بن کر سامنے آئے' یا اقبال کی تعلیم کی پیروی کر کے اپنے آپ کو "انسانِ کامل" بنانے کی کوشش کرے۔

نطشے کے فوق البشر کا تصور واضح کرتے ہوئے جناب باسط بلال نے کہا کہ نطشے فوق البشر اس شخص کو کہتا ہے جو شعوری طور پر انسان کی حیوانیت اور درندگی' اس کے وجود کے لاحاصل اور بے نتیجہ ہونے' اور اس کی زندگی کے بے مقصد اور بے کار ہونے کو قبول کرے گا۔ وہ تسلیم کرے گا کہ خدا کا کوئی وجود نہیں' مذہب اور اخلاق محض کمزور اور بزدل عوام کے گھڑے ہوئے ڈھکوسلے ہیں' اور موت کے بعد جزا و سزا کا کوئی امکان نہیں۔ نطشے کہتا ہے کہ فوق البشر اپنا اخلاق خود تعمیر کرے گا اور ہر شخص کو اس کے احکامات کی بلاچون وچرا اطاعت کرنا پڑے گی۔ سب کو اخلاق کا وہی معیار قبول کرنا ہو گا جو مستقبل کا فوق البشر متعین کر دے گا۔

اس کے بالکل برعکس مستقبل کے انسان کا تصور وہ ہے جو اقبال پیش کرتا ہے۔ اقبال کے خیال میں "انسانِ کامل" وہ شخص ہے جو شعوری طور پر اپنی انسانیت کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی روح کو ترقی دیتا ہے۔ وہ مانتا ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے' اور زندگی کا مقصد اس خالق کی مرضی کے مطابق اپنے وجود کو ڈھال لینا ہے۔ انسان کامل بخوبی آگاہ ہے کہ اس کا وجود جہاں حیوانی اور ارضی ہے وہیں اس میں ایک روح ملکوتی بھی پوشیدہ ہے' جو اس کا رشتہ ایک غیر مرئی عالم سے برقرار رکھتی ہے۔ انسان کامل اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ اس کی روح وہ جوہر ہے جو اسے دیگر تمام مخلوقات سے ممیّز کرتی ہے۔ وہ اپنے رب کی

معرفت حاصل کرتا ہے اور اس کی صفات کا عکس اپنی شخصیت میں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کامل کی سعی و جہد کا اصل ہدف یہ ہوتا ہے کہ پوری نوع انسان کو عرفانِ خودی اور معرفتِ رب کی دولت حاصل ہو جائے اور انسان کا رشتہ دوبارہ اس کے خالق کے ساتھ استوار ہو جائے۔

اپنے خطبے کے آخر میں جناب باسط بلال نے کہا کہ اسلامی تعلیمات میں دجالِ اکبر کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی ہے' جو نطشے کے فوق البشر کا مصداق معلوم ہوتا ہے' اور حضرت مہدی کا ذکر ملتا ہے جو اقبال کے "انسانِ کامل" کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت میں انجمن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اصل میں تو "انسانِ کامل" کا تاج صرف حضور ﷺ کے سر پر سجتا ہے' لیکن حضورؐ کی تعلیمات کے پوری دنیا میں عام ہونے اور نوع انسان کا ان تعلیمات کو قبول کرنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔

☆ ☆ ☆

تیسرا خطبہ ۲۱/ اپریل کو پیش کیا گیا اور جناب ڈاکٹر خالد علوی صاحب نے صدارت کی۔ اس خطبے کا عنوان تھا "اسلام کا مستقبل"۔ جناب باسط بلال نے کہا کہ دورِ جدید کا انسان غیب پر ایمان لانے سے محروم ہو چکا ہے۔ فلسفیانہ سطح پر یہ اسلام کی تقدیر ہے کہ وہ جدید ذہن کو دوبارہ ایک ماورائے حواس عالم سے روشناس کرائے گا اور اسے دوبارہ غیبی امور پر ایمان رکھنے کے قابل بنائے گا۔ لیکن اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ خود اسلامی فکر بڑی حد تک جدیدیت سے متاثر ہو چکی ہے' چنانچہ مسلمان بھی اگرچہ خدا کے وجود کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن یہ کیفیت کہ اللہ تعالیٰ کو ہر آن رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب محسوس کیا جائے مفقود ہے۔ مسلمان یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اللہ نے ہمیں ماضی بعید میں پیدا کیا تھا اور مستقبل بعید میں وہ ہمارا محاسبہ کرے گا' لیکن درمیانی مدت میں گویا اس کا کوئی عمل دخل ہے ہی نہیں۔ اسی طرح جدیدیت کے زیر اثر مسلمانوں کے پڑھے لکھے اور دانشور طبقے نے روح اور جسم کی ثنویت کا کہیں واضح اور کہیں مبہم انداز میں انکار کر دیا اور اس طرح گویا روحانیت کو مسترد کر دیا گیا۔ اسی طرح آخرت پر ایمان کو کماحقہ' اہمیت نہیں دی

گئی۔ دین کے غلبے کے لئے جدوجہد کرنے والے بھی بھول گئے کہ اصل جذبہ محرکہ اسلام کے نظام حیات کی خوبیاں نہیں بلکہ محاسبۂ اخروی کا شدید احساس ہونا چاہئے۔

فاضل مقرر نے کہا کہ اگر اسلام کو فلسفیانہ سطح پر فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے تو اس کے لئے اسلام کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں میں توازن پیدا کرنا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارا سارا زور اسلام کے ظاہر یعنی شریعت پر ہو گیا ہے' لیکن اس کے ساتھ اسلام کے باطن یعنی طریقت یا تصوف پر بھی توجہ ہونا چاہئے تاکہ ایمان محض زبانی اقرار سے بڑھ کر ایک اندرونی طور پر محسوس کی جانے والی حقیقت کا روپ اختیار کر سکے۔

فاضل مقرر نے کہا کہ آنے والے دور میں سائنس پرستی کی جگہ ایمان باللہ کو پُر کرنا ہے۔ یعنی یہ کہ سائنس کبھی بھی اس علم پر اضافہ نہیں کر سکتی جو قرآن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ عمرانیات کے ضمن میں لادینیت ختم ہو جائے گی اور اس کا خلاء ایمان بالرسالت سے پُر ہو گا۔ یعنی جو سماجی اقدار حضور ﷺ ۔ انسانیت کو دی ہیں' کوئی معاشرتی علم ان اقدار پر اضافہ نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح نظریۂ حیات کے ضمن میں ایمان بالآخرۃ آخرکار سرمایہ داری کی جگہ پُر کرے گا۔ یعنی توجہات کا اصل ارتکاز نجاتِ اخروی پر ہو گا اور سعی وجہد کا مقصد دنیا کی آسائشوں کا حصول نہیں بلکہ آخرت کی فلاح ہو گی۔

فاضل مقرر نے اسلام کے باطنی پہلو کے احیاء کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی فکر کی جانب سے روحانیت اور مابعد الطبیعیات کی اہمیت کا اقرار بجائے خود جدید مغربی سوچ کے خلاف اسلام کا اعلانِ آزادی ہو گا' نیز اس سے اسلام میں حرکت اور تحریک (Dynamism) کے لئے اصل جذبہ محرکہ (یعنی ایمان) پھر سے پیدا ہو سکے گا۔ انہوں نے کہا محض شریعت پر زور دینے سے مادیت پیدا ہوتی ہے اور صرف طریقت کو اہمیت دی جائے تو ہمہ اوستی قسم کا عوامی مذہب جنم لیتا ہے۔ ان انتہاؤں کے بجائے ہمیں توازن اختیار کرنا چاہئے۔

جناب باسط بلال نے کہا کہ اگرچہ جدیدیت کے عقائد سہ گانہ کی جگہ لینے کے لئے ایمانیاتِ ثلاثہ موجود ہیں' تاہم ان کی حیثیت محض فلسفیانہ تصورات کی رہے گی جب تک

کہ ان ایمانیات کی بنیاد پر ایک معاشرہ قائم نہ کر دیا جائے۔ افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر حقیقی ایمان پیدا کریں اور شعوری طور پر فیصلہ کریں کہ انہیں شریعت کے مطابق اور طریقت کی روشنی میں زندگی گزارنا ہے۔ وہ اپنے اندر یہ احساس پیدا کریں کہ محض انفرادی طور پر اسلام کے مطابق جینا کافی نہیں بلکہ اجتماعی نظام کو بھی اسلام کے مطابق استوار کرنا لازم ہے اور اس لئے ایک منظم تحریک بھی ضروری ہے۔

آخر میں جناب باسط بلال نے Samuel Huntington کے حوالے سے کہا کہ مغربی طاقتوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا بھی فیصلہ ہے کہ اسلام کا عالمی غلبہ لازماً ہو کر رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تصادم فی الواقع ناگزیر ہے۔ مغرب کی طرف سے عالمِ اسلام کو دو راستے دیئے جا رہے ہیں۔ اگر ہم مغربی فکر اور تمدن کو پوری طرح اختیار کر لیتے ہیں تو ہم اس دور کی غالب تہذیب میں ضم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھیں گے' دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں اور مقابلے اور تصادم کے لئے تیار ہو جائیں۔ ان حالات میں ہم میں سے ہر ایک کو جائزہ لینا چاہیے کہ اس کا وزن کس پلڑے میں ہے؟ اگر غلبۂ اسلام کے لئے ہم اپنی قوتوں اور اوقات کو استعمال نہیں کرتے تو اس کا پورا امکان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں برباد کر کے کسی دوسری قوم کو اپنے دین کا سپاہی بنا دے گا۔

تیسرے خطبے کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی اور انجمن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مہمان مقرر جناب باسط بلال نے حاضرین کے سوالات کے مشترکہ طور پر جوابات دیئے۔ اس طرح محاضراتِ قرآنی برائے ۱۹۹۶ء کا پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔ OO

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سُورۃ البقرۃ

آیت ۸۳

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ 'الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۵۱ : ۲ الاعراب

زیر مطالعہ آیت کی اعرابی ترکیب کو آسانی سے سمجھنے کے لئے سات جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام جملے واوات العاطفہ' ثم العاطفہ اور ایک واو الحال کے ذریعے باہم مل کر بلحاظ مضمون ایک ہی مربوط طویل جملے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ذیل میں ان سات ممکنہ جملوں کے اعراب پر الگ الگ بات کی جاتی ہے اور پھر جس جملے کا جس بھی سابقہ یا مابعد جملے سے جو تعلق ہے وہ بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا جائے گا۔

① [وَاِذ اخذنا میثاق بنی اسراء یل]

[وَ] مستانفہ اور [اِذ] ظرفیہ ہے ("وَاِذ" والی ترکیب کئی دفعہ گزر چکی ہے) [اَخَذْنَا] فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر ہے جس میں ضمیر تعظیم "نَحْنُ" مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے

ہے۔ [میثاق] فعل "اخذنا" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے۔ علامتِ نصب آخری "ق" کی فتحہ (ـَـ) ہے کیونکہ یہ (میثاق) آگے مضاف ہونے کی بناء پر خفیف بھی ہے۔ [بَنِی] مجرور بالاضافہ ہے (یعنی "میثاق" کا مضاف الیہ ہو کر) علامتِ جر اس میں آخری یاء ماقبل مکسور (ـِـ ی) ہے جو جمع مذکر سالم کا اعراب (برائے مجرور) ہے۔ یہ [بَنِی] آگے [اسراء یل کا] مضاف ہو کر خفیف بھی ہے (یہ دراصل "بنیین" تھا' بوجہ اضافت آخری "ن" گر گیا ہے) اس کے بعد [اسراء یل] مضاف الیہ (لہٰذا) مجرور ہے' علامت جر اس میں آخری "ل" کی فتحہ (ـَـ) ہے۔ کیونکہ یہ عجمی (غیر عربی) علم ہے اس لئے غیر منصرف ہے۔

② [لاتعبدون الاالله]

[لَا] نافیہ ہے اور [تعبدُون] فعل مضارع صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جو بذریعہ "لا" مضارع منفی ہے (لاتعبدون) اس کے بعد [الا] حرف استثناء برائے حصر ہے (نفی کے بعد "اِلّا" اداۃ حصر کا کام دیتا ہے' یعنی یہ ایک محدود مفہوم پیدا کرتا ہے' یعنی "صرف" اور "محض" کے معنی دیتا ہے) [اللّٰہَ] یہاں "تعبدون" کے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کی یہ نصب استثناء [الا] کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کلام منفی غیر تام ہے ---- یا یوں سمجھئے کہ اگر ہم حرف نفی (لا) اور حرف استثناء (الا) دونوں نکال دیں تو باقی عبارت "تعبدون اللہَ" بچتی ہے جس میں "الله" مفعول بہ ہو کر ہی منصوب ہے۔

● یہ عبارت (جملہ نمبر۲) سابقہ (جملہ نمبر۱) کی تفسیر ہے یعنی "بیان میثاق" ہے۔ نحوی اعتبار سے یہاں ایک "اَن" (کہ) کا مفہوم موجود ہے۔ اس لئے اس جملے میں جو بظاہر خبریہ ہے "نہی" کا مفہوم ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ بصورت فعل نہی (لاتعبدوا) کیا گیا ہے --- دیکھئے حصہ "اللغۃ" میں اس کے تراجم۔

③ وبالوالدين احسانا وذى القربى واليتامى والمساكين

[وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے "بیان شرائط میثاق" کے پہلے حصے (لاتعبدون الاالله) کو جو دراصل نہی (لا تعبدوا) کے مفہوم میں ہے واو عاطفہ کے ذریعے اگلے محذوف فعل امر "اَحْسِنُوا" (جس کا بیان ابھی ہو گا) سے ملا دیا گیا ہے (یعنی لا تعبدوا .... وَاحسنوا) کے مفہوم میں۔ [بالوالدين] جار مجرور (بِ + الوالدين) مل کر متعلق فعل مقدم ہے اور [احسانًا] ایک محذوف فعل (مثلاً "اَحْسِنُوا") کا مفعول مطلق (مصدر) ہے اور اسی لئے

منصوب ہے (اگر محذوف فعل امر کچھ اور سمجھیں مثلاً "اسْتَوْصُوا" "پوری توجہ دو" کا تو "احسانًا" کو مفعول بہ بھی کہا جا سکتا ہے' تاہم "اَحْسِنُوا" کے ساتھ مصدر یعنی مفعول مطلق سمجھنا زیادہ آسانی سے قابل فہم ہے)۔۔۔ یوں دراصل اس عبارت کی مقدر (اور مفہوم) نثر یوں بنتی ہے "وَاَحْسِنُوا احسانًا بِالوالدین" (اور بھلائی کرو اچھی طرح بھلائی کرنا ماں باپ کے ساتھ) اور اس میں "بِالوَالدین" کی "باء (ب)" کو فعل (اَحْسِنوا) کا صلہ سمجھ کر "بِالوَالدین" کو مفعول بہ قرار دے کر محلاً منصوب بھی کہا جا سکتا ہے اور جار مجرور (بالوالدین) کی تقدیم (پہلے لانے) کی بناء پر اس میں تاکید اور خصوصی ذکر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے' جس کو اردو ترجمہ میں "اور خصوصاً والدین کے ساتھ" (بھلائی کرنا) سے ظاہر کیا جانا چاہئے' تاہم اکثر مترجمین نے جار مجرور کی تقدیم کے اس پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔ [وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے [ذی القربی] کو [بالوالدین] پر عطف کیا گیا ہے' یعنی "احسنوا بالوالدین و(بِ) ذی القربٰی" کا مفہوم ہے اور اسی لئے یہ "ذی" بحالتِ جر آیا ہے۔ "القربٰی" مجرور بالاضافہ ("ذی" کا مضاف الیہ ہو کر) ہے۔ "ذی" میں تو علامت جر "ی" ہے مگر "القربٰی" کے اسم مقصور (الف مقصورہ پر ختم ہونے) کی بناء پر اس میں کوئی اعرابی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔

[وَالیتامٰی] میں بھی "و" برائے عطف ہے اور یہ بھی "بالوالدین" پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔۔۔ "الیتامٰی" بھی اسم مقصور ہے لہٰذا اس میں کوئی ظاہراً علامتِ جر نہیں ہے۔

[وَالمساکین] کی "و" بھی عطف کے لئے ہے اور "المساکین" بھی "بالوالدین" کی "باء" کے اثر (عمل) سے مجرور ہے۔ "مساکین" ویسے غیر منصرف لفظ ہے مگر یہاں چونکہ معرف باللّام ہو کر مجرور بھی ہے اس لئے اس میں علامتِ جر آخری "ن" کی کسرہ (ـِ) کی شکل میں موجود ہے۔ خیال رہے یہ لفظ (مساکین) جمع مکسر ہے اور اس میں اعرابی علامت آخری "ن" میں ہی ظاہر ہو گی۔ بظاہر دھوکا لگتا ہے کہ شاید یہ کوئی جمع مذکر سالم ہے یعنی یہ لفظ "مساکون / مساکین" نہیں ہے۔ البتہ "مسکین" کی جمع مذکر سالم "مسکینون / مسکینین بھی عربی میں استعمال ہوتی ہے۔ (قرآن کریم میں اس کی صرف جمع مکسر ہی استعمال ہوئی ہے)۔ حرف عطف کی بار بار تکرار کی بناء پر ہی بامحاورہ اردو ترجمے میں مندرجہ بالا کلمات (ذِی القربٰی / والیتامٰی / وَالمساکین) کے تراجم میں "بھی" کا اضافہ کرنا پڑتا ہے (دیکھئے اس عبارت کے تراجم حصہ "اللّغۃ" میں)

۳ [وقولوا للنّاس حُسنًا]

[وَ] عاطفہ ہے جو مابعد جملے کو ماقبل جملے سے ملاتی ہے یا یوں کہئے کہ اس کے ذریعے اگلے صیغہ امر [قُولُوا] کو سابقہ محذوف صیغہ امر (احسنوا) پر عطف کیا گیا ہے یا اس سے پہلے "قلنا لهم" محذوف سمجھ لیں یعنی یہ دراصل "وقلنا لهم قولوا..." بنتا ہے۔ [للناس] میں ابتدائی "لام" (ل) فعل (قال' جس کا صیغہ امر یہاں آیا ہے) کا صلہ ہے جو مفعول اول (جس سے بات کی جائے) سے پہلے آتا ہے اور یوں یہ جار مجرور (للناس) محلاً نصب میں ہے یا اس جار مجرور کو متعلق فعل (قالوا) بھی کہہ سکتے ہیں۔ [حُسْنًا] فعل [قولوا] کا دوسرا مفعول (جو بات کہی جائے) ہے لہٰذا منصوب ہے' مگر یہ اسم صفت نہیں ہے۔ اگر یہ "حَسَنًا" ہوتا (جیسا کہ بعض قراءات میں ہے) تو اسے ایک محذوف مفعول مطلق کی صفت سمجھا جا سکتا تھا یعنی [قَولًا حَسَنًا] (اچھی بات) مگر قراءتِ حفص (جو ہمارے ہاں رائج ہے اور ہم اسی کے مطابق اعراب بیان کر رہے ہیں) میں یہ "حُسْنًا" ہے' جس کا ترجمہ "خوبصورتی یا اچھائی" ہی ہو سکتا ہے' اس لئے یہاں محذوف مفعول مطلق "قولًا" کی صفت سمجھنے کے لئے اس "حُسْنًا" کو "ذَا حُسْنٍ" کے معنوں میں لینا پڑتا ہے' یعنی "کہو لوگوں سے" "قَولًا ذَا حُسْنٍ" (خوبی/اچھائی/خوبصورتی والی بات)۔ مفہوم و معنی اس کا بھی وہی "قَولًا حَسَنًا" (اچھی بات) والا ہی ہے --- مگر بلحاظ ترکیب مختلف ہے۔

⑤ وَاقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ

[وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے آگے آنے والے فعل امر بصیغہ جمع مذکر حاضر [اقِيمُوا] کو سابقہ فعل امر (قُولُوا) پر عطف کیا گیا ہے یا "وَ" کے مابعد جملے (اقيموا الصلٰوة) کو سابقہ جملے (قُولُوا للناس حُسْنًا) پر عطف کیا گیا ہے۔ [الصلٰوةَ] فعل "اقِيمُوا" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے' علامتِ نصب آخری "ۃ" کی فتحہ (ـَـ) ہے۔ اس کے بعد پھر [وَ] برائے عطف ہے جو یہاں دو جملوں کو ملا رہی ہے۔ [آتُوا] بھی فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اور [الزَّكٰوةَ] اس کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے۔ گویا یہ دراصل دو مستقل جملے ہیں --- مگر باہم ایک دوسرے پر معطوف ہونے کے علاوہ ابتدائی "واو العطف" کے ذریعے سابقہ جملوں (نمبر ۳ و نمبر ۴) پر عطف ہونے کے باعث ایک ہی جملے کے حکم میں (بلحاظ تسلسل مضمون) آئے ہیں۔ یعنی جس "میثاق" لینے کا ذکر شروع آیت میں تھا' یہاں (جملہ نمبر ۵) تک اس میثاق کی شرائط کا بیان ختم ہوتا ہے۔ اسی لئے یہاں وقف مطلق کی علامت (ط) لگائی جاتی ہے۔

⑥ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ

[ثُمَّ] حرف عطف ہے جس میں ترتیب اور تراخی (یعنی "پھر کچھ عرصہ بعد یہ ہوا کہ") کا مفہوم

ہے اور نحوی اعتبار سے یہاں "ثُمَّ" ایک محذوف عبارت پر عطف ہے۔ گویا اخذِ میثاق اور شرائطِ میثاق کے ذکر کے بعد تقدیر (مفہوم) عبارت یوں بنتی ہے "فقَبِلتم المیثاقَ" (تم نے وہ میثاق قبول کیا) "ثُمَّ..... (پھر یہ ہوا کہ) [تَوَلَّیتُمْ] فعل ماضی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے (تم روگردانی کر گئے۔ پھر گئے) [اِلّا] حرف استثناء (بمعنی مگر/سوا) ہے اور [قلیلًا] مستثنیٰ "بِاِلّا" ہے۔ اور چونکہ اس سے پہلے کلام مثبت تام (نفی کے بغیر مکمل جملہ) ہے اس لئے یہ مستثنیٰ متصل ہو کر منصوب ہے۔ ویسے چونکہ "قلیل" اسم صفت ہے اس لئے یہاں ایک موصوف محذوف ہے یعنی "نفرًا قلیلًا" یا "عددًا قلیلًا"۔ [منکم] جار مجرور (مِن + کم) "قلیلًا" کا بیان (وضاحت) ہے یعنی "تم میں سے کم/تھوڑے"۔ اس جملے کے مختلف تراجم حصہ "اللغۃ" میں گزر چکے ہیں۔

⑤ وانتم معرضون

[وَ] یہاں حالیہ ہے اور [انتم] ضمیر مرفوع منفصل مبتدأ ہے [مُعرِضُون] خبر (لہٰذا) مرفوع ہے علامتِ رفع آخری نون (اعرابی) سے پہلے والی "واو" ماقبل مضموم (ـُـوْ) ہے جو جمع مذکر سالم میں علامت رفع ہوتی ہے۔ اس طرح یہ جملہ حالیہ ہو کر محل نصب میں ہے اور یہ حال مؤکدہ (یعنی صرف تاکید کے لئے) ہے اور یہ "تولیتم" کی ضمیر فاعلین کا حال ہے۔ یعنی تم پھر گئے اور "تمہارا تو حال ہی یہ ہے کہ پھر جانے والے ہو" کا مفہوم رکھتا ہے اور بعض نحوی "تولیتم" کی ضمیر فاعلین "آباؤُھم" (ان کے باپ دادا) کے لئے اور "انتم" کو "انفسھم" (یعنی خود ان کے) لئے سمجھتے ہیں۔ یعنی تمہارے باپ دادا پھر گئے اور تمہاری عادت بھی روگردانی کی ہے"۔ بنی اسرائیل کے بیان میں بہت جگہ ضمیر مخاطب (کُم یا اَنتُم) "آباءَ کم یا آباؤُکم" کے لئے آئی ہے' مثلاً البقرۃ:۴۹ میں "وَاِذ نَجّینا کم" میں مراد "تمہارے بڑوں کو" ہی ہے۔

بہرحال یہ (زیر مطالعہ) جملہ حال ہونے کی وجہ سے دراصل سابقہ جملے (نمبر۶) کا ہی ایک حصہ بنتا ہے۔

۲ : ۵۱ : ۳ الرسم

زیر مطالعہ آیت کے کلمات میں سے بلحاظ رسم آٹھ کلمات توجہ طلب ہیں۔ ان میں سے چار (الیتٰمٰی' المسٰکین' الصلٰوۃ اور الزکٰوۃ) کا رسم قرآنی (عثمانی) متفق علیہ ہے اور چار کلمات (میثاق' اسراء یل' بالوالدین اور احسانًا) کا رسم عثمانی مختلف فیہ ہے۔ ہر ایک کلمہ کی تفصیل (آیت میں ترتیب کے مطابق) یوں ہے:

① "میثاق" : یہ لفظ جو قرآن کریم میں مفرد مرکب معرفہ نکرہ صورتوں میں ۲۵ جگہ آیا ہے، ہر جگہ الدانی کے مطابق رسم املائی کی طرح "باثبات الالف بعد الثاء" لکھا جاتا ہے جبکہ ابوداؤد کی طرف منسوب قول کے مطابق یہ "بحذف الالف بعد الثاء" یعنی بصورت "میثق" لکھا جاتا ہے۔ برصغیر، لیبیا اور دوسرے عرب و افریقی ممالک کے مصاحف میں اس کے رسم میں اختلاف کی یہی وجہ ہے۔ نیز دیکھئے البقرۃ : ۲۷ [۳:۱۹:۲] میں۔

② "اسراءیل" جس کا عام رسم املائی "اسرائیل" ہے۔ اس لفظ کے رسم املائی اور رسم عثمانی (قرآنی) میں ایک فرق تو متفق علیہ ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنی رسم میں "ئیل" کو "ءیل" لکھا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانی میں ہمزہ نہیں لکھا گیا تھا بلکہ صرف "یل" لکھا گیا تھا، بعد میں جب ہمزہ کی علامت (ء) اور اس کی املاء کے قواعد بنے تو رسم قرآنی میں ایک دندانہ کا اضافہ بھی ناجائز سمجھا گیا۔ دوسرا فرق مختلف فیہ ہے کہ "الدانی" کے مطابق یہ لفظ "اسراءیل" یعنی "باثبات الالف بعد الراء" لکھا جاتا ہے مگر ابوداؤد کے مطابق یہ الف (بعد الراء) کتابت میں حذف کر کے لفظ بصورت "اسرءیل" لکھا جاتا ہے (پھر بذریعہ ضبط اس الف کو ظاہر کیا جاتا ہے)۔ تاہم اس "الف بعد الراء" کے اثبات کے حق میں زیادہ دلائل ہیں {۲}۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ تمام مشرقی ممالک (برصغیر، ایران، ترکی وغیرہ) کے علاوہ افریقی ممالک مثلاً تیونس، لیبیا، مراکش، غانا اور نائیجریا کے مصاحف میں بھی باثبات الف "اسراءیل" ہی لکھا جاتا ہے۔ غالباً صرف مصر اور شام کے مصاحف میں (اور سعودی مصحف تو دراصل شامی مصحف ہی ہے) اسے بحذفِ الف (بعد الراء) لکھا گیا ہے۔ نیز دیکھئے البقرۃ: ۴۰ کے ضمن میں بحث الرسم [۳:۲۸:۲] میں اس لفظ پر بحث۔

③ "بالوالدین": قرآن کریم میں لفظ "والد" (واحد مذکر) مفرد یا مرکب (مضاف ہو کر مثلاً "والدہٖ") صورتوں میں کل تین جگہ آیا ہے اور اس کا تثنیہ مرفوع "الوالدان" بھی تین دفعہ آیا ہے اور اس کا تثنیہ مجرور مرکب (مضاف ہو کر مثلاً بوالدیکَ، بوالدیہِ، لوالدیہ اور والدیَّ کی شکل میں) دس جگہ آیا ہے اور اس کا تثنیہ مجرور بغیر اضافت (بالوالدین، للوالدین وغیرہ کی شکل میں) سات جگہ آیا ہے۔ لفظ "والدۃ" (واحد مؤنث) مفرد ایک جگہ اور مرکب (مضاف ہو کر) یعنی بصورت "والدتک اور والدتی" دو جگہ آیا ہے اور بصورت جمع مؤنث سالم (الوالدات) بھی صرف ایک جگہ آیا ہے۔

{۲} اختلاف اور دلائل کے لئے دیکھئے المقنع (للدانی) ص ۲۲۔ دلیل الحیران (للمارغنی) ص ۷۵، ۷۷ اور نثر المرجان (للارکاٹی) ۱:۳۰

● ان تمام کلمات (جن کو ہم نے یہاں فرق سمجھانے کے لئے رسم املائی میں لکھا ہے) کے رسم قرآنی کے بارے میں بعض باتیں متفق علیہ اور بعض مختلف فیہ ہیں۔ مثلاً :

① اس پر اتفاق ہے کہ لفظ "والد" (واحد مذکر) ہمیشہ "باثبات الالف بعد الواو" (یعنی رسم املائی کی طرح) لکھا جائے گا۔ یہ بات الدانی کے سکوت سے (کہ اس نے اس الف کے حذف کی بات نہیں کی) اور ابوداؤد سلیمان بن نجاح کی تصریح سے ثابت ہے {۳} (کہ یہ الف برقرار رہے گا)

② "والدان" (تثنیہ مرفوع) کا "الف بعد الدال" (جو علامتِ رفع ہے) کتابت میں محذوف ہو گا یعنی نہیں لکھا جائے گا۔ اس پر الدانی اور ابوداؤد کا اتفاق ہے {۴}۔ اور

③ اس پر بھی اتفاق ہے کہ جمع مونث سالم کے تمام ایسے صیغے جن میں دو الف آتے ہیں (اور "الوالدات" بھی ایسا ہی صیغہ ہے) ان میں دونوں الف کتابت میں محذوف کر دیئے جاتے ہیں {۵}

● اور ان کلمات کے رسم میں مختلف فیہ امور حسب ذیل ہیں۔

① لفظ "والدة" (واحد مؤنث) ہمیشہ بحذف الف بعد الواو لکھا جائے گا۔ یہ قول ابوداؤد کا ہے {۶} الدانی نے اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے جو اثباتِ الف کو مستلزم ہے۔ چنانچہ بعض اسے بحذفِ الف اور بعض باثباتِ الف لکھتے ہیں۔

② اس لفظ (والد) کے تثنیہ کی تمام صورتوں میں (مفرد آئے یا مرکب) یعنی بالوالدین' والدیہ' والدیک وغیرہ میں ابتدائی الف بعد الواو بھی کتابت میں محذوف ہو گا۔ یہ قول بھی صرف ابوداؤد کا ہے۔ {۷} یہاں بھی "الدانی" کا سکوت اثبات الف کو مستلزم ہے۔

● مندرجہ بالا تصریحات کی بناء پر ان کلمات کے رسم قرآنی میں اختلاف ہوا ہے ---- ان کلمات کے الگ الگ رسم پر تو اپنی اپنی جگہ وضاحت ہو گی' یہاں ہم ان اصولوں (متفق یا مختلف) کی روشنی میں زیر مطالعہ لفظ "بالوالدین" (اور اس سے ملتی جلتی صورتوں مثلاً للوالدین یا والوالدین)

{۳} دیکھئے دلیل الحیران شرح مورد الظمان للخراز ص ۸۶ ۔ نیز سمیر الطالبین (للضباع) ص ۶۱

{۴} دیکھئے دلیل الحیران ص ۸۹۔ والمقنع (للدانی) ص ۱۷ اور نثر المرجان ۱:۳۱

{۵} دیکھئے المقنع ص ۲۳ اور دلیل الحیران ص ۵۲

{۶} دیکھئے دلیل الحیران ص ۸۶ اور سمیر الطالبین ص ۶۱

{۷} ابوداؤد کا یہ قول سمیر الطالبین (للضباع) ص ۶۱ میں منقول ہوا ہے۔

کے رسم کی بات کرتے ہیں۔ اس کے رسم میں یہ اختلاف ہوا ہے کہ ابوداؤد کے قول پر عمل کرنے والے ممالک (مثلاً مصر' شام' نائیجریا' تیونس' مراکش' غانا' وغیرہ) میں تو اسے بحذف الف بعد الواو یعنی بصورت "بالولدین" لکھا جاتا ہے جب کہ الدانی کی عدم تصریح (یا سکوت) کے باعث (یا واحد "والد" پر قیاس کرتے ہوئے) لیبیا اور ایشیائی ممالک (برصغیر وغیرہ) میں اسے باثبات الف (بصورت "بالوالدین") لکھا جاتا ہے۔

④ "اِحسانًا": اس لفظ کے رسم (ھجاء) کے متعلق الدانی یا ابوداؤد میں سے کسی نے بھی کسی حذف کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے برصغیر کے علاوہ مصر' شام' لیبیا اور نائیجریا کے مصاحف میں یہ اسی طرح (احسانًا) لکھا جاتا ہے' تاہم علم الرسم کے ایک اور عالم علی بن محمد المرادی البلنسی نے اپنی کتاب "المنصف" میں (جو اب تک کہیں طبع بھی نہیں ہوئی) اس "الف بعد السین" کے حذف کا ذکر کیا ہے اور اس کے اتباع میں بہت سے افریقی ممالک (مثلاً تیونس' مراکش اور غانا) میں اسے بحذف الالف بعد السین یعنی بصورت "اِحسنًا" لکھنے کا رواج ہے۔ صاحب نثر المرجان نے اس الف کے حذف کی ایک توجیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ اس لفظ میں پے در پے تین "الف" جمع ہو گئے ہیں' اس "اجتماعِ اَمثال" کو ناپسند کرتے ہوئے ایک الف محذوف کرنا پڑا اور ابتدائی اور آخری تو حذف نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا درمیانی الف کو کتابت میں حذف کر دیا گیا{۸}۔

⑤ "الیتٰمٰی" (جو "یتیم" کی جمع ہے اور جس کا املائی رسم "الیتامٰی" ہے)۔ قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ ۱۴ جگہ آیا ہے) "بحذف الالف بعد التاء" لکھا جاتا ہے۔ اور رسم عثمانی اور رسم املائی ہر دو میں اس کا آخری الف (مقصورہ) بصورت "ی" ہی لکھا جاتا ہے۔ اس کا عثمانی رسم "الیتمی" ہے۔

⑥ "المسکین" (جس کا عام رسم املائی "المساکین" ہے) یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ قرآن کریم میں ۱۲ جگہ آیا ہے) "بحذف الالف بعد السین" (یعنی واحد "مسکین" کی طرح) لکھا جاتا ہے اور پھر بذریعہ ضبط اس الف کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

⑦ "الصلوٰۃ": ان آٹھ الفاظ میں سے ہے جن کے قرآنی رسم میں الف کو بصورت "و" لکھا جاتا ہے (یہ الفاظ الصلوٰۃ' الزکوٰۃ' الحیوٰۃ' منوٰۃ' النجوٰۃ' الغدوٰۃ' مشکوٰۃ' اور الربوٰ ہیں) البتہ اگر یہ کسی ضمیر کی طرف مضاف ہوں تو پھر الف کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں جیسے صلاتھم' حیاتکم میں ہے۔ ان میں سے بعض کے بارے میں کچھ استثناء بھی ہیں جن کا

{۸} دیکھئے سمیر الطالبین (للضباع) ص ۱۴۹ اور نثر المرجان ۱: ۱۷۵

بیان اپنی جگہ ہو گا۔ نیز دیکھئے البقرۃ : ۳[۲:۲:۳] میں۔

⑧ "الزکوۃ": یہاں اور ہر جگہ "ک" کے بعد الف کی بجائے "و" سے لکھا جاتا ہے' پھر بذریعہ ضبط "و" کو "الف" کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

۲ : ۵۱ : ۴ الضبط

وَاِذْ' اِذْ / اَخَذْنَا' اَخَذْنَا' اَخَذْنَا / مِيْثَاقَ' مِيثَاقَ' مِيثَاقَ / بَنِيْ' بَنِيْ' بَنِي / اِسْرَاءِيْلَ' اِسْرَاءِيلَ' اِسْرَاءِيلَ / لَا تَعْبُدُوْنَ' لَا تَعْبُدُونَ' لَا تَعْبُدُونَ / اِلَّا اللّٰهَ' اللّٰهَ' اللّٰهَ / وَ بِالْوَالِدَيْنِ' بِالْوَالِدَيْنِ' بِالْوَالِدَيْنِ / اِحْسَانًا' اِحْسَانًا' اِحْسَانًا / وَذِي الْقُرْبٰى' ذِي الْقُرْبٰى / وَالْيَتٰمٰى' الْيَتٰمٰى' الْيَتٰمٰى / وَالْمَسٰكِيْنَ' الْمَسٰكِيْنَ' الْمَسٰكِيْنَ / وَقُوْلُوْا' قُوْلُوْا' قُوْلُوْا / لِلنَّاسِ' لِلنَّاسِ / حُسْنًا' حُسْنًا / وَاَقِيْمُوا' اَقِيْمُوْا' اَقِيْمُوْا / الصَّلٰوةَ' الصَّلٰوةَ' الصَّلٰوةَ / وَاٰتُوا' اٰتُوْا' اٰتُوْا / الزَّكٰوةَ' الزَّكٰوةَ' الزَّكٰوةَ / ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ' تَوَلَّيْتُمْ' تَوَلَّيْتُمْ / اِلَّا' اِلَّا' اِلَّا / قَلِيْلًا' قَلِيْلًا' قَلِيْلًا / مِّنْكُمْ' مِّنْكُمْ' مِّنْكُمْ / وَاَنْتُمْ' اَنْتُمْ' اَنْتُمْ / مُّعْرِضُوْنَ' مُّعْرِضُوْنَ' مُّعْرِضُوْنَ

بقیہ : روداد اجلاس

مارچ ۱۹۹۶ء تک ارسال کردیں۔ یہ بھی لکھ دیا گیا کہ اس تاریخ کے بعد آنے والی تجاویز اور نامکمل قرطاس تجاویز قابل قبول نہیں ہوں گے۔

مقررہ تاریخ گزرنے کے بعد جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ تینوں حلقوں میں سے مکمل تجاویز صرف اس قدر آئی ہیں کہ جتنی نشستیں خالی ہوئی ہیں' اس طرح انتخاب کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ نتیجتاً مندرجہ ذیل مجوز حضرات بلامقابلہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

حلقہ نمبر ۱ میں

۱ ۔ جناب حافظ عاکف سعید صاحب ۲ ۔ جناب ڈاکٹر عارف رشید صاحب

۳ ۔ جناب وقار احمد صاحب ۴ ۔ جناب قمر سعید قریشی صاحب

۵ ۔ جناب چوہدری شہباز الدین صاحب ۶ ۔ جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب

۷ ۔ محمد بشیر ملک (جو ویسے بھی از روئے دستور بطور ناظم انتخاب مجلس شوریٰ کے بلا انتخاب ممبر شمار ہوتے ہیں)

حلقہ نمبر ۲ مستقل ارکان میں سے

۱ ۔ جناب احسن الدین صاحب ۲ ۔ جناب ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب

اور حلقہ نمبر ۳ عام ارکان میں سے

۱ ۔ جناب رحمت اللہ بٹر صاحب ۲ ۔ جناب غازی محمد وقاص صاحب

۳ ۔ جناب الطاف حسین صاحب ۴ ۔ جناب چوہدری محمد اسحاق صاحب

حضرات! یہ ہے تفصیلی داستان انتخاب جو میں نے پیش کردی ہے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ"

یوں انتخاب کے عملی انعقاد کی نوبت نہیں آئی اور یہ مرحلہ بحسن وخوبی طے ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی انجمن کا یہ چوبیسواں سالانہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ آخر میں شرکاء اجلاس کی تواضع عشائیے سے کی گئی۔

Church dogma. The Gospel of Barnabas was among the books that were banned in 325 C.E by the Nicean Council; it was forbidden by the Decree of the Western Churches in 382 C.E; it was again banned by Pope Innocent in 465 C.E, and then by the Glasian Decree in 496 C.E. To this day, Christian authorities refuse to accept the Gospel of Barnabas as authentic, despite striking similarities between this Gospel and the documents discovered in 1947 in the caves of Qumran, popularly called as the Dead Sea Scrolls. This is because the Gospel of Barnabas proclaims absolute Divine Unity, criticizes the pagan innovations of St. Paul, declares the truth about the myth of Crucifixion, and, above all, contains unambiguous prophecies regarding the advent of Prophet Mohammad (Peace be upon him), all of which is enough to destroy the very foundations of the Christian faith as it exists today. However, any unbiased comparative study of the New Testament, the Dead Sea Scrolls, and the Gospel of Barnabas is bound to reveal that this gospel is the correct and genuine account of the life and teachings of Prophet Jesus (Peace be upon him), the flimsy doubts being created by the Christians notwithstanding.

To be continued

بقیہ : امام مسلم بن حجاج

(۱۳) عبدالرشید نعمانی' ماتمس الیہ الحاجہ' ص۳۶۔ (۱۴) طاہرالجزائری' توجیہ النظر' ص۱۸۵۔
(۱۵) ابن خلکان' وفیات الاعیان' ج ۲' ص ۱۲۷۔ (۱۶) شبیراحمد عثمانی' مقدمہ فتح الملہم' ص۱۰۰۔
(۱۷) امام مسلم' صحیح مسلم باب التشہد۔ (۱۸) نووی' مقدمہ نووی۔
(۱۹) شبیراحمد عثمانی' مقدمہ فتح الملہم' ص۹ (۲۰) نووی' مقدمہ نووی' ص ۱۳۔
(۲۱) شبیراحمد عثمانی' مقدمہ فتح الملہم' ص۹۶۔ (۲۲) صدیق حسن خان' اتحاف النبلاء' ص۴۸
(۲۳) شبیراحمد عثمانی' مقدمہ فتح الملہم' ص۹۹۔ (۲۴) عبدالسلام مبارکپوری' سیرت البخاری' ص ۲۱۴
(۲۵) عبدالسلام مبارکپوری۔ سیرت البخاری' ص۲۱۵ (۲۶) ضیاالدین اصلاحی' تذکرۃ المحدثین' ج ۲' ص ۴۳۹۔
(۲۷) صدیق حسن خان' اتحاف النبلاء' ص۵۰۔

revived: the Christ then met with his disciples, and, after giving them some instructions, ascended into the heaven.

On the other hand, the Holy Qur'an strongly rejects the idea of Jesus having been crucified, and according to the most authentic traditions of Prophet Mohammad (Peace be upon him), Jesus Christ was saved from such an accursed and humiliating death by direct Divine intervention, and raised up alive into the heavens. It has also been unequivocally explained in A'hadith that Jesus will reappear on earth to live out the rest of his life and to fulfill his Divinely ordained mission, and then he will die like any other mortal.

The only void left in this Islamic tradition, however, concerns the "when" and "where" of Jesus' ascension, and the question regarding "who" actually got crucified in his place. This vacuum can be satisfactorily filled with the help of the narration in the "Gospel of Barnabas" according to which, when the traitor Judas Iscariot came ahead of the Roman soldiers and entered the garden where Jesus Christ was hiding, Almighty God caused his face and voice to be changed so that he looked and talked exactly like Jesus, while in the meantime the prophet himself was raised up into the heavens. Thus it was the traitor who was crucified, and Jesus Christ (Peace be upon him) was miraculously saved by Almighty God.

It may be pointed out here that, unlike Barnabas who was a close disciple and companion of Prophet Jesus, none of the writers of the four so-called authentic gospels — i.e., Matthew, Mark, Luke, or John — ever met with the prophet himself. These gospels were written between 70 C.E and 115 C.E. but their earliest available manuscripts date back to the fourth century C.E, making their authenticity rather dubious. Throughout the early period of Christianity, a number of different gospels were in circulation, the manuscripts of which were freely altered and amended by the copyists in order to suit the doctrines of their particular sect. The four gospels that are included in the New Testament were accepted as genuine by the Church — and the rest were rejected as apocryphal, and their possession prohibited — not on the basis of authenticity, but only because these four books were in conformity with the official

new community. However, preaching in the name of Jesus Christ, the actual founder of Christianity, St. Paul, simply abrogated the Mosaic law (Romans 4:15). Michael Hart has the following to say in his book "The Hundred":

> Paul, more than any other man, was responsible for the transformation of Christianity from a Jewish sect into a world religion. His central ideas of the divinity of Christ and of justification by faith alone have remained basic to Christian thought throughout all the intervening centuries ... Indeed, the influence of Paul's ideas has been so great that some scholars have claimed that he, rather than Jesus, should be regarded as the principal founder of the Christian religion.

(2) According to the Holy Qur'an, Jesus Christ was appointed a prophet only for the Israelites (3:49 & 61:6), and this is confirmed by his sayings which appear in the Gospels (Matthew 10:5,6 & 15:24), where he forbids his disciples from extending their evangelistic activity outside that circle. However, a controversial step was taken in this respect by St. Paul, who persuaded the small number of early followers of Jesus — after a period of serious dispute — to preach among the non-Jews as well. As it happened, Paul had met with little success among the Israelites, but his sweeping innovations made the new faith much more palatable for the neighboring pagan people, and thus his brand of Christianity rapidly gained popularity among these nations.

The Myth of Crucifixion

Last, but not the least, is the matter of the alleged crucifixion of Jesus Christ (Peace be upon him), regarding which there is a crucial disagreement between the Islamic belief and the account of the four Canonical Gospels. According to the latter, the supreme Jewish authority in Roman Palestine — the Sanhedrin — convicted Jesus of blasphemy and insisted for a death sentence, which was carried out by the Roman governor Pilate Pontius by way of crucifixion. Afterwards, on the third day, the dead body of Jesus was miraculously resurrected and

corruption. He severely criticized the pretentious religiosity, the emphasis on hollow but legally spotless rituals, and the servile adherence to the letter of the law with no regard to its spirit - the hallmark of the religious establishment of his time. (Matthew 23, and the Holy Qur'an 5:78). As a result, he became the target of the acrimony and malevolence from the rabbis, the priests, and the pharisees.

(4) The message and proclamation of Jesus Christ attracted the attention of the population both in and around Jerusalem, but it was accepted only by a very minute section of the Jews, of which even fewer became his dedicated companions. The number of these close comrades, according to the Gospels, was twelve, although the matter of their names is controversial.

(5) Jesus was raised up alive from the earth, and he will reappear some time before the end of the world. This has been mentioned in Matthew 28:6,7; Mark 16:19; Luke 24:51, John 20:17. Ascension and reappearance of Jesus Christ has also been alluded to in the Holy Qur'an (4:157, 158 and 43:61), but these hints are explained more explicitly in the Hadith.

Innovations by Paul

Then we have a couple of very important points, regarding which the Qur'an and Hadith as well as the four Gospels are unanimous, but which have been radically tampered in fact transformed by St. Paul during the period immediately following the departure of Jesus Christ. These innovations have changed what was only a reform movement among the Jews into a philosophical religion full of pagan conceptions.

(1) It is abundantly clear from Matthew 5:17-19, Luke 16:17 and Mark 13:31, that Jesus Christ (Peace be upon him) had no intention whatsoever to give any new law, nor to rescind and abolish the Mosaic law, as he was sent by Almighty God only to renew and reinforce the law of the Torah, to purify his people from spiritual and moral degeneration, and to revive the authentic spirit of *Deen*. He was, obviously, one of the Jews and was not supposed to become the founder of a new religion and a

Although the myth of the Crucifixion of Jesus Christ is narrated in all the four Gospels, there is absolutely no substance whatsoever in them for the doctrine of Trinity or that of the Divine Sonship of Jesus. The earliest evidence of the last two doctrines first appeared in the writings of St. Paul, and these were adopted as official beliefs of Christianity only after extensive debate, and following a long-standing controversy which included, at times, violent episodes between Unitarians and Trinitarians. These dogmas were confirmed as official beliefs of the Church, after much deliberation, during the Council of Nicaea in 325 CE, almost three centuries after the departure of Jesus Christ.

Five Points of Convergence

As far as the personality of Jesus Christ (Peace be upon him) is concerned, we find that there are at least five significant points which are common between the Holy Qur'an and the Hadith on the one hand, and the four Canonical Gospels on the other. It is indeed significant that more than half of the world's population is in agreement regarding these points, three of which are in clear opposition with the normal physical laws of the universe. We shall discuss them one by one.

(1) The Gospel of Matthew (1:18-24) and Luke (1:26-38) mention that Jesus was conceived without a human father, as a miracle from Almighty God; so does the Holy Qur'an (3:45-47 & 19:17-21)

(2) Jesus Christ performed the most astonishing of miracles – unparalleled in the history of Prophethood with respect to their unambiguous and explicit nature. These miracles are described in various sections of the Gospels (See, for example, Matthew, Chapters 8 & 14) as well as in the Holy Qur'an (3:49 & 5:110)

(3) Jesus Christ forcefully and incisively called upon his fellow Israelites to mend their perverted ways, to give up sinful and unethical practices, to repent with the true spirit of repentance, and to purify themselves from all spiritual and moral

although a very significant initial role will be played by the Christian nations. In order to correctly interpret and fully comprehend these prophecies, it is imperative for us to understand the nature and history of Christian faith.

A set of three doctrines is common to the followers of most of the Christian denomination, viz., the Trinity, Crucifixion of Jesus Christ, and Atonement. The most basic creed of modern Christianity is, of course, the belief that the God is one, in three persons, and in one substance: God the father, God the son, and God the Holy Spirit are not three gods, but one God. The Holy Qur'an emphatically rejects and condemns this polytheistic view.

> O People of the Book, do not be fanatical in your faith, and say nothing but the truth about God. The Messiah who is Jesus, son of Mary, was only a messenger of God, and a command of His which He sent to Mary, as a mercy from Him. So believe in God and His messengers, and do not call Him 'Trinity'. For God is only one God. (4:171)

> They are surely infidels who say: "God is the Christ, son of Mary" ... Disbelievers are they surely who say: "God is the third of the Trinity"; but there is no god other than God the one. (5:72,73)

The Holy Qur'an also contradicts their belief that Jesus Christ (Peace be upon him) was humiliated and executed on the cross, and thus indirectly refutes the theory of Atonement — the belief that the great sacrifice from the "Son of God" was necessary to remove the burden of the Original Sin from the shoulders of humanity. According to the Qur'an:

> And (the Jews were punished, among other things, because) of saying, "We killed the Christ, Jesus, son of Mary." — who was a Messenger of God — but they neither killed nor crucified him, though it so appeared to them. They have no knowledge about it, other than conjecture, and surely they did not kill him. (4:157)

Muslims, as was done before and during the Crusades. This process of brainwashing is exemplified by the recent campaign to inculcate the idea, with reference to the writings of Nostradamus, that the "Anti-Christ" is going to be a Muslim ruler from among the Arabs.

The very idea of Muslims going back to their roots — the Holy Qur'an and the Sunnah of Prophet Muhammad (Peace be upon him) — is being depicted as a dangerous combination of extremism, terrorism, and fanaticism. Unfortunately, after the end of Cold War and the demise of Communism, Islam and Muslims are increasingly being used to fill the vacuum of the "Great Menace" against which the West can test her powers. With ever rising zeal, Islamic Fundamentalism is being portrayed as the ultimate evil against which the forces of decency must unite. Despite all this continuing disinformation about the horrible hazard of Islam, the fact remains that, in the history of Muslim-Christian relationship, it was always the Muslims who suffered heavily at the hands of the Christian nations and not the other way round. And it seems that the history is likely to repeat itself in an other "Clash of Civilizations."

A B C Of Christianity

According to the Qur'an, there has been only one true religion throughout human history, i.e., Islam; all other systems of belief and worship, as they exist today, are nothing but corrupted and distorted replicas of the originally pure and simple teachings of various messengers of God. Most versions of these teachings have been perverted beyond recognition, and the historical continuity and doctrinal similarity of only two of them — Judaism and Christianity — can at present be linked with Islam. Among these three major faiths, as mentioned earlier, only the followers of Judaism and Islam can be described as Ummahs: Jews or the Israelites as the previous Muslim ummah, and the followers of Prophet Muhammad (Peace be upon him) as the present and final Muslim Ummah. According to the prophecies as they appear in the Hadith, the ultimate conflict of the future is going to take place between Jews and Muslims,

Confucianism, — instead of the domain of Revealed religions like Judaism and Islam.

Coming back to the original topic of our discussion, it is significant to note that Christian nations have played a crucial role vis-à-vis the second phase of decline with regard to both the Jews and the Muslims. Thus the torture, persecution, genocidal killings, and exile suffered by the Jews during the last sixteen hundred years were executed exclusively by the Christians. Ever since the conversion of Romans to Christianity in the fourth century C.E., Jews have continuously been made the target of various allegations, and killed by the thousands on one pretext or the other. Similarly, it was the Christians who were responsible for the brutal massacre suffered by the Muslims during the Crusades, and then the subjugation and exploitation of the Muslim Ummah at the hands of Western Imperialism. From even a superficial survey of Jewish and Muslim histories, therefore, it becomes clear that God the Almighty has been using the Christian nations as an instrument of His punishment — the whip of His retribution, so to speak — for both the Jews and Muslims of the world.

However — and this is vital for us to remember — there has been a profound metamorphosis in the nature of the relationship between the Jews and Christians during the present century. As a result of this radical change, the Christian world — particularly the White Angle-Saxon Protestants or WASP — have become devoted comrades and staunch supporters of the Jewish nation, although they are, in fact, only being cleverly used and manipulated by the latter. On the other hand, the highly ruthless historical role of the Christians in relation to the Muslim Ummah is still very much intact. As such, there is a clear possibility of another massive assault, a'la Crusades, that can work havoc upon the Muslims, particularly the Arab world. Such an event can obviously result in killings and destruction on a huge scale, a minor glimpse of which has already been witnessed in the Gulf War.

The way in which the "threat" of militant and fundamentalist Islam is being hyperbolized by the Western media betrays an attempt to create public hatred against the

acquiescence. It seems, therefore, that there is no power on earth that can prevent the establishment of "Greater Israel."

Under these apparently hopeless circumstances only the predictions of the Holy Qur'an and Hadith can reassure us. According to these predictions, the third phase of rise for the Muslims will be accompanied by the global domination of Islam, which will last till near the end of the world, whereas the present rise of the Jews is going to prove ephemeral. Moreover, as mentioned before, the conflict between the Jews and the Muslims is going to result, ultimately, in the total extermination of the former, according to the Divine law of "annihilation of the worst." The most significant role in this conflict — which is gradually warming up to its grand finale — is going to be played by a third power, the Christians.

Third of the Trinity: The Christians

An interesting theme that is common to all pagan religions is the idea of "henotheism"; whenever there has been a group of people that worshipped a number of divine beings, we find that there is always a Supreme Deity which is considered superior to all other gods and goddesses. This trend is most prominent in Hinduism, in the Greek and Roman mythologies, and among the pagan Arabs of the pre-Islamic era. However, what is really important to note in such religions is that, in actual practice, the smaller gods and goddesses always get the lion's share in the attention and devotion of their worshipers, while the Supreme God disappears in the background, as He is carelessly ignored and casually brushed aside by the worshipers.

Applying this analogy to the three Abrahamic faiths, we can say that although Christianity is the biggest among them in terms of the number of adherents, yet in reality — except for the name and personality of Jesus Christ (Peace be upon him) — there is hardly any thing in this religion that can be described as "Christian." The doctrines and practices of Christianity, as they exist toady, have more to do with the innovations of St. Paul than with the real teachings of Jesus Christ. Christianity, in the form in which it exists today, actually belongs to the realm of philosophical religions — along with Hinduism, Taoism, and

Dr. Ahmed Afzaal

LESSONS FROM HISTORY VI

Based on the Urdu Columns by: Dr. Israr Ahmad

Jewish Revival

As mentioned before, the beginning of the third and final phase of rise for the Muslims is coincidental with the temporary upswing of the Jews, It can be seen that, at the present moment, the upward trend in the history of the Muslim Ummah is not only very slow and gradual, but that it is still in its initial stages. On the other hand, the same trend among the Jews has not only started much earlier, but theirs has been far more rapid and swift. Thus, the ingenious scheme prepared by the "Elders of Zion" in 1897, and the political Zionism of Theodore Herzel (1860-1904), bore fruit within a short period of twenty years, resulting in the Balfour Declaration by the British Government on November 2, 1927, that paved the way for the "establishment in Palestine of a national home for the Jewish people." Finally, the illegitimate state of Israel was born on May 14, 1948, with the British Government acting as midwife.

The situation at the moment is that not only Israel herself is a formidable military power, but the entire Western world is also there to support and patronize her, both economically and with respect to arms supply. The sole Super Power of our time — the United States — is practically in the tight grip of a small Jewish minority, who is able to exert an immense amount of control over the international policies of US. This last mentioned fact has been forcefully proved by former US Congressman Paul Findly, in his best-selling book *"They Dare to Speak Out."* More importantly, the global financial system is virtually in the hands of Jewish bankers, who, through the institution of interest or usury, have become powerful enough to command the obedience of entire governments. Finally, the monarchs and rulers in most of the Arab countries have either made their peace with Israel or are desperately looking for opportunities to demonstrate their servile

NOW AVAILABLE

The Inaugural Issue of

The Qur'anic Horizons

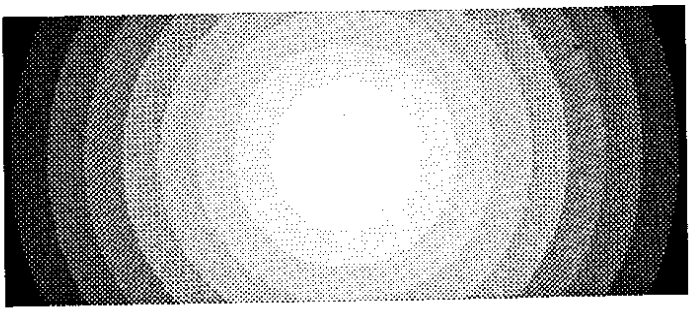

Price per issue: Rs. 30/- Annual Subscription: Rs. 100/-

حکمت قرآن کے مستقل قارئین The Quranic Horizons کا پہلا شمارہ
بطور نمونہ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ خط لکھ کر پرچہ طلب کیجئے اور اپنے خریداری نمبر
کا حوالہ ضرور دیجئے۔

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore